

افسانوی مجموعہ

شکارے کی موت

مصنف

پرویز مانوس

ایک شاعر
ایک ادیب
ایک صحافی
ایک عزیز دوست
جناب سلیم سالک کے لئے
نہایت ہی خلوص کے ساتھ

14/11/2004

وقت کے ساتھ افسانے کا مزاج بھی بدل چکا ہے۔
آج کے افسانے کا مطلب ہے تحریر کے ذریعے زندگی کے سلگتے ہوئے
مسائل ... ... پکارنا۔ سماج ... طبقوں کی عکاسی
کرنا ... معاشرے کے منفی رجحانات کو ... پر لاکر اس کی
اصلاح کے اسباب فراہم کرنا۔ ... تہذیب
و تمدن کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینا۔ نادار اور پسماندہ
طبقوں کی ترجمانی کرنا۔ عریانیت کو حیا کے پیکر عطا کرنا۔ اپنے
آباء واجداد کے خوابوں کو جلا بخشنا۔ وہ چاہے علامتی، تمثیلی
تجریدی یا پھر بیانیہ افسانے ہوں لیکن قاری کی بصیرت میں اضافہ کریں
"شکارے کی موت" انہی خوبیوں کا مرقع ہے اور
پرویز مایوس کے تجربات کی پختگی کا ثبوت بھی۔
پرویز مایوس جدید دور کے افسانہ نگاروں میں اپنا
اہم مقام رکھتے ہیں۔ اُن کے افسانے مختلف انواع،
حد بندیوں، حصاروں اور ردِ عمل کے طور پر ظہور میں آنے
والی کیفیتوں کو اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہے۔
انہوں نے حب الوطنی، آپسی بھائی چارگی، جنسی استحصال،
بے چینی، گھٹن، تشدد، بے روزگاری، جہیز، بھوک، افلاس
اور عصری مسائل پر اپنے قلم کے وسیلے سے فن کی بلندی اور حقیقت
نگاری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ آج کا افسانہ انہی باتوں کا
تقاضا کرتا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی انکے افسانے مکمل ہیں۔
انکی تحریریں، اُنکے تجربے اور مشاہدے کی گواہی دیتی ہیں۔
اُن کا اسلوب منفرد اسلوب ہے جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر
نہیں رہ سکتا۔ مجھے امید ہے کہ انکی ذات سے نئی جدت ملے گی۔
اور خطۂ پونچھ کا نام روشن تر ہوگا۔

محمد اسلم قریشی (ڈپٹی کمشنر پونچھ)

شکارے کی موت

(افسانوی مجموعہ)

مصنّف

پرویز مایوس

ہسپتال روڈ نزدیک آل انڈیا ریڈیو پونچھ سٹی جموں وکشمیر

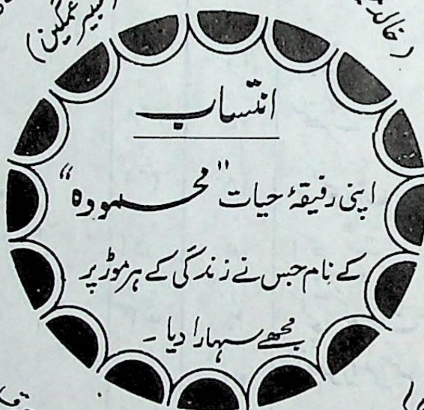
جون ۱۹۹۵ء

"پرویز مایوس نے جدید دور میں آنکھ کھولی اور اپنے گرد پھیلی ہوئی کہانیوں کو ہی اپنے افسانوں کا مجموعہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ مایوس کے افسانے حقیقت پر مبنی لگتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں پلاٹ، اٹھان، کردار، منظر نگاری اور مکالمے کا برابر خیال دکھا ہے۔ اُن کا افسانوی مجموعہ "شکارے کی موت" اس کی بہترین دلیل ہے۔"

(بشیر غمگین)

"شکارے کی موت" جدید طرز کے افسانوں میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔"

(خالد میر)



"پرویز مایوس کے قلم میں مقناطیسی قوت ہے جو الفاظ خود ان کے قلم کے نیچے پناہ لینے چلے آتے ہیں۔"

(جاوید راہی)

"شکارے کی موت" پرویز مایوس کا وہ افسانوی مجموعہ ہے جس پر اردو ادب کو فخر حاصل ہوگا"

مسز شوکت میر

نام کتاب ــــــــــ شبکارے کی موت

مصنّف ــــــــــ پرویز مایوس

کتابت ــــــــــ منظور قادری سرینگر

سال اشاعت ــــــــــ ۱۹۹۵ء

طباعت

قیمت ــــــــــ ۳۰ روپے

تعداد صفحات ــــــــــ ۱۶۰

درخشاں پبلیکیشن نزد ریڈیو اسٹیشن پونچھ سٹی

پیش لفظ

پریم چند سے لے کر سعادت حسن منٹو تک اُردو ادب میں بہت سے کامیاب افسانہ نگار ہوئے ہیں اور منٹو کے بعد بھی یہ سلسلہ کہیں رُکا نہیں بلکہ اس فہرست میں نوادر قلمکاروں کا روز بروز اضافہ ایک خوش آیند ادبی کامیابی کی علامت ہے۔ پرویز مایوسی اسی ادبی قافلے کا ایک فرد ہے جس نے تقسیم وطن کے بعد آنکھیں کھولیں اور ترقی پذیر ہندوستان کے سلگتے ہوئے مسائل بیکاری، جہیز کے مسائل، نشے کا استعمال، نوجوان نسل کی والدین سے برگشتگی، غریبی فرقہ وارانہ تناؤ، بے چینی، حقوق کی پامالی، انسانیت کا عدم احترام، غنڈہ گردی، سیاست کے کارن سماج میں پھیلی آلودگی وغیرہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے پروان چڑھتے اور پنپتے دیکھا اور اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

ادیب ایک مصلح نہیں لیکن ناگفتہ بہ حالت سے اپنی آنکھیں بھی موند نہیں سکتا۔ اس لیے اِس کی تیسری آنکھ جو کچھ اسے دکھاتی ہے، اُسے وہ قلم کے ذریعہ عوام تک پہنچاتا ہے۔ ترسیلِ فکر کے اِس پروسس (PROCESS) میں شعوری طور پر ایک مُصلح (REFORMER) کا انداز بھی اختیار کر لیتا ہے ——

پرویز مایوسی کے ہاں یہ امر بہ انداز دگر کارفرما ہے۔ وہ مسائل بیان کرنے سے زیادہ اُن کے اظہار کے لیے بے تاب دکھائی دیتا ہے۔ اِس اظہار و ابلاغ کے لیے وہ افسانے کی دو تکنیکی اصناف کا سہارا لیتا ہے۔ مختصر افسانہ اور افسانچہ (منی کہانی)۔ فنی طور سے دونوں اصناف سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جُداگانہ (TREATMENT) کی ضرورت ہے۔ افسانچہ تیکھے، تیز کلائمکس

فہرست

میں پھنس کر گھر سے بھاگی لڑکیوں کا المیہ ہے جن کو آخر کار سماج ٹھکرا دیتا ہے۔

آج کے دور میں بے اعتمادی اور فرقہ پرستی نے جو تباہی مچا رکھی ہے اُس کا خوبصورت عکس "سانجھی دھرتی"، نامہ افسانہ ہے۔ "پتھر کے صنم" ایک خوبصورت اور رومانی افسانہ ہے جس میں محبّت کو عبادت کا درجہ دیا گیا ہے اور کرداروں کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا ہے۔ "ریلیف" ایک بہت ہی خوبصورت افسانہ ہے جس میں سرکاری افسران کے جنسی اور معاشرتی مسائل کا ذکر کیا گیا ہے۔ "چوتھا کونہ"، ستم اور بھوک پیاس کی چکّی میں پس رہے مظلوم عوام کے استحصال کے موضوع پر کشمیری معاشرت کی خوشبو لیے ہوئے ایک خوبصورت کہانی ہے جس میں پرویز مایوسؔ کو طبقاتی کشمکش اور اس سے پیدا ہوئے مسائل کی عکاسی کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اس افسانے میں مایوس پریم چند سے کافی حد تک متاثر لگتا ہے۔ اس کے علاوہ "ادھورا موسم" اور "کچا گوشت" میں بھی مایوس کرشن چندر سے متاثر لگتا ہے۔ جس میں اُس نے دیہاتوں کے جہنم زاروں کی بے بس زندگی کو اُبھارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مجموعی طور پر کتاب میں ۱۲ افسانچے و افسانے شامل ہیں جن میں "چوتھا کونہ"، "ریلیف"، "زخمی پل"، "کچا گوشت" اور "شکارے کی موت" اُردو ادب میں گرانقدر اضافہ کہے جا سکتے ہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ پڑھ کر لگتا ہے کہ مستقبل میں پرویز مایوسؔ سے بہتر لکھنے کی اُمید وابستہ کی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ مطالعہ و مشاہدہ کی معیت میں اپنا ادبی سفر خلوصِ نیت و خدمتِ ادب کے جذبہ سے جاری رکھے تاکہ وہ آنے والی نسل کے لیے مشعلِ راہ بن سکے۔

خالد حسین

ڈپٹی ڈائریکٹر اسٹیٹ۔ جموں

اور موضوع تک براہ راست رسائی کا تقاضا کرتا ہے جبکہ مختصر افسانہ تخلیق کے مراحل سے بتدریج گزرتا ہے۔ پلاٹ کا انتخاب، کردار نگاری، زبان، مکالمے، ڈیولپمنٹ، چابک دستی، فن کاری، منظر نگاری اور کلائمکس میں ایک خوشگوار توازن ہونا لازمی ہے جو کہ پرویز مایوس کے یہاں پوری طرح موجود ہے۔

پرویز مایوس نے دونوں اصناف پر طبع آزمائی کی ہے اور ایک ہونہار افسانہ نگار ہونے کے ثبوت بہم پہنچائے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جہیز (جہیز کے لیے ساس کے بہوؤں کا استحصال) ایجی ٹیشن (لیڈر بازی کر کے مقصد حاصل کرنے کا رواج) "ٹیوشن" (اخلاقی اور تعلیمی گراوٹ) "بھاو" (شادی کے لئے لڑکوں کی قیمت لگانا) "پولیس" (غنڈے بدمعاشوں کا پولیس میں بھرتی ہونا) "دوست" (غم کو دوست اور خوشی کو دشمن کہنا) "سزا" (پولیس کی طرف سے زیر حراست عورتوں کا جنسی استحصال) "احساس" دوسرے کے گھر میں آگ لگا کر یہ سوچنا کہ میرا گھر محفوظ رہے گا) مختصر افسانے ہیں جن کو چست زبان اور تیکھے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔

پرویز مایوس کے افسانوں میں "شکارے کی موت" جس کے عنوان پر مجموعہ ترتیب دیا گیا ہے، ایک ایسا افسانہ ہے جس میں اُس نے کشمیر کی موجودہ صورت حال کو اپنے نظریہ سے بیان کیا ہے۔ افسانے کی منظر نگاری قابل ستائش ہے۔ اِسی مجموعہ میں (کل ہند کہانی مقابلہ بہار کا) ایک انعام یافتہ افسانہ "زخمی ہل" بھی شامل ہے جس میں حب الوطنی کے جذبے کو اُبھارنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی آج ضرورت بھی ہے۔ "لہو کی مہندی" افسانہ (آج کے حالات کا المیہ ہے) دہشت گردی نے بے قصور اور معصوم لوگوں کے خون کی ہولی کھیلنے کا جو سلسلہ روا رکھا ہے اُس کو عُمدہ طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ "طوائف" افسانہ عشق و محبت کے جال

اِظہارِ خیال

خطۂ پونچھ ادب و سخن، علم و ہنر، طنز و مزاح اور فنونِ لطیفہ کا اہم مرکز رہا ہے۔ اس سرزمین نے جہاں نامور شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کو اپنی کوکھ سے جنم دیا۔ وہاں اِس دھرتی کو ناز ہے جیالے نوجوانوں پر جنھوں نے جان کی بازی لگا کر اپنے دیش کی بقا کو محفوظ رکھا اور اَنا پر آنچ نہ آنے دی۔

سرسبز شاداب جنگل، ہرے بھرے کھیت، آسمان سے سرگوشیاں کرتے ہوئے برف پوش پہاڑوں کے یہ سلسلے، سوکھے ہونٹوں کی تراوت بخشنے والے میٹھے پانی کے یہ چشمے، صاف اور شفاف بہتے ہوئے خوبصورت جھرنے، امن و آشتی اور آپسی بھائی چارہ کی آماجگاہ، یہ دھرتی ایک قابلِ تقلید ورثہ تھا جس کو قائم و دائم رکھنے میں قانونِ قُدرت اور اس کی مخلوق کا بھرپور تعاون شامل رہا تھا اور پھر وقت نے ایسی کروٹ بدلی کہ ہنستا مسکراتا اور بے خطر آشیانہ نظرِ بد کا شکار ہوگیا۔

ابھی سُجھائے نہ تنکے کہ گر پڑی بجلی
بنا نہ تھا کہ لگی آگ آشیانے میں

دیکھتے ہی دیکھتے نفرت کا ایک طوفان اُٹھا۔ ہر طرف کہرام مچا۔ انسان نے درندے کی شکل اختیار کر لی۔ اچھے اچھے دماغ پاگل پن کا شکار ہو گئے۔ ہنسی اس آشیانے سے روتے روتے رخصت ہوگئی اور خوشیوں نے غم کا جامہ پہن لیا۔ خطۂ پونچھ کو بین الاقوامی ادبی نقشوں پر ابھارنے والے نامور صحافی، بلند پایہ کے دانشور اور علم و ادب کے رُوحِ رواں ملک کے بٹوارے کا شکار ہو گئے۔ ہر طرف خاموش سنّاٹا چھا گیا۔ فکر و فن کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر

پرویز مایوسؔ نے برصغیر کی معروف ادبی شخصیات کرشن چندر، ٹھاکر پونچھی، چراغ الحسن حسرت وغیرہ (جن کا تعلق سرزمین پونچھ سے ہے) کی روشن کی ہوئی قندیل تھام کر اپنا ادبی سفر شروع کیا اور خطہ پونچھ میں ان کی یاد کو تازہ رکھا۔

جہاں تک پرویز مایوسؔ کی افسانہ نگاری کا تعلق ہے۔ اِن کے یہاں فکری عمق اور تخیل کی گہرائی اور گیرائی تو ہے ہی، ساتھ ہی ہیں آج کے اس دھواں دھواں فضا میں اُن کی کھلی آنکھوں نے جو مناظر دیکھے، بغیر کوئی رنگ و روغن چڑھائے بے کم و کاست اپنے افسانوں میں ڈھالا۔ قدم قدم پر قدروں کی پامالی انسانیت کا عدم احترام، ہر شعبۂ حیات میں استحصال و حق تلفی، فسادات کا تسلسل، انسانی خون کی ارزانی، غربت و افلاس، تہذیب و شائستگی کا فقدان، ٹوٹتے بکھرتے خواب، اِن سب کی جھلک مکمل طور پر اِن کے افسانوں میں ملتی ہے۔ اِن کے افسانے نئے طرزِ فکر، اور طرزِ احساس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں اور قاری سے غور و خوض کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اِن کی تحریروں میں جوش، فکر، امنگ اور کچھ کہنے کی خواہش ہے اور یہی وہ خلوص ہے جو ان کے افسانوں کو پڑھنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ ادیب فطرتاً کسی نہ کسی بڑی شخصیت سے متاثر ہوتا ہے۔ اِسی طرح مایوسؔ کی آنکھ کبھی پریم چند کی طرح سرکاری عملہ اور سرمایہ داری کو محض ظالم قرار دیتی ہے اور کرشن چندر کی طرح جا و بیجا نسوانی حُسن کو عریاں دیکھ کر جنسی لذّت کو محسوس کرتی ہے۔ اِس کی زندہ مثال ان کے چند افسانے ریلیف۔ کچا گوشت، زخمی ہل، اور چوتھا کونہ ہیں جن میں وہ پریم چند اور کرشن چندر سے کافی متاثر ہیں۔ مجموعی طور پر "شکارے کی موت" اُردو ادب کی سربلندی اور ترقی کے لیے مایوسؔ کی بے مثال اور استقلال کی بہترین دلیل ہے۔

محمد یوسف گلکار
سیّد حمید پورہ۔ سری نگر
نوب بازار

گامزن تھا کہ تیسری پیڑی نے آنکھ کھولی۔ اس وقت ادبی سرگرمیاں، بالکل ماند پڑ چکی تھیں۔ چند نوجوانوں نے ہاتھ میں "بزمِ حسرت" کی ادبی مشعل اٹھائی اور خطۂ پونچھ کو پھر سے ادبی روشنی بخشی۔ ان نوجوانوں میں پرویز مایوس، شوکت میر، جاوید راہی، خورشید کرمانی وغیرہم شامل ہیں جنھوں نے اس دھرتی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ یہ نوجوان ادبی فنکار اِس خطہ کی عظمت و وقار کو اپنے بلند حوصلہ اور غیر متزلزل طرزِ فکر سے سنوارنے کی سمت گامزن ہیں۔ یہ نوجوان اُردو ادب اور خطۂ پونچھ کے درخشندہ مستقبل کا آئینہ دار ہیں۔ اسی بزم کے ایک رکن پرویز مایوس کا ایک خوبصورت شعری مجموعہ "بیتے لمحوں کی سوغاتیں" گذشتہ سال منظرِ عام پر آیا جس میں اُنھوں نے شاعری کی مثال پیش کی تھی۔ ان کے کلام میں جہاں کرب و درد کی جھلک نمایاں ہے وہاں اِن کے اشعار میں حبّ الوطنی، مذہبی رواداری، بھائی چارگی کے جذبات اُن کے ہمعصر ساتھیوں کے لئے قابلِ تقلید اور مشعلِ راہ ہیں۔

پرویز مایوس کا افسانوی مجموعہ "تسکاریے کی موت" اُن کی پہلی کاوش ہے۔ پرویز مایوس کے افسانے محض افسانے نہیں، بلکہ انہوں نے اپنے افسانوں میں سماج اور معاشرے کی اصلاح کی ہے۔ انھوں نے سماج میں چھُپے ہوئے نقاب پوش درندوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ پرویز مایوس نے جہاں مظلوم اور نادار طبقے کی حمایت کی ہے وہاں رشوت خوری، ہوس پرستی کے خلاف اپنے قلم کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ انہوں نے قلم کی سیاہی سے ظالم سماج کے مُنہ پر طمانچہ مارا ہے۔ پرویز مایوس کا قلم الفاظوں کا محتاج نہیں بلکہ الفاظ اُن کے قلم کے محتاج ہیں۔ ان کے افسانے پڑھنے کے بعد اُن کے گہرے مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ پرویز مایوس نے اپنے افسانوں میں جو خوبصورتی بھری ہے، جو منظر کشی کی ہے وہ اُدبائے پونچھ کے لئے ایک زندہ و جاوید مثال ہے

قطروں میں بٹ گیا۔ خطۂ پونچھ مایوسی کے عالم میں ڈوب گیا۔ چاروں طرف فضا میں اداسی ہی اداسی بکھر گئی۔

ایک سوالیہ نشان ہر ذہن میں اُبھر رہا تھا کیا پھر کبھی یہ خطۂ ادبی سرگرمیوں کی رعنائیوں سے ہمکنار ہونے کے قابل ہو سکے گا؟ کیا اس بنجر دھرتی پر پھر کبھی علم وادب کے ہل چلیں گے؟ کیا پھر مسکراہٹ یہاں کے لوگوں کا مقدّر بن سکے گی؟ کیا اس سرزمین پر دوبارہ ہنسی اور خوشی رقص کر سکے گی؟

لیکن تاریخ شاہد ہے اس دھرتی کی کہ رات جتنی سنگین ہوتی ہے صبح اتنی ہی رنگین اور دلکش ہوتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے فضا میں نئی خوشبو بکھر گئی۔ تقسیم وطن کے بعد خطۂ پونچھ میں رونما ہوئے غیر معمولی واقعات میں تعمیری تبدیلی کی پیش رفت ہوئی ——— انتشار اور اضطراب کے بادل چھٹنے لگے۔ کدورت بغض ونفرت کا زہر کافور ہو گیا۔ خلوص ——— ایمان اور بھائی چارہ کا جذبہ ٹوٹے دلوں کو جوڑنے کا سبب بنا۔ ایک بار پھر اُجڑے چمن میں بہار نے پاؤں پسارنے کی جسارت کی، گلشن میں رنگین فضا گردش کرنے لگی۔ ادبی چمن کے بھنورے اپنے اپنے آشیاں سے نکل کر گلشن کی سرمستیوں میں بے خطر گنگنانے لگے۔ ادبی نشستوں کا اہتمام ہونے لگا، نظم ونثر کی محفلیں سجنے لگیں۔ اس ادبی کارواں میں چوہدری دیانند کپور، ڈاکٹر سرون ناتھ آفتاب، ڈاکٹر دوارکا ناتھ، چوہدری گرداری لال برق، بلدیوراج رہبر قابل ذکر ہیں۔

لیکن ادبی محفلوں کو بارونق اور پُرکشش بنانے میں چوہدری دینا ناتھ رفیق، موتی لال کپور، بشو لال آزاد، بھائی جے دیودت، محمود الحسن محمود مسعود الحسن مسعود، درشن سنگھ اکالی، نور محمّد نور، شیخ سجّاد حُسین جیسے ادبی فنکاروں نے اہم رول ادا کیا۔

یہ تھا دوسری پیڑی کا دور۔ اس طرح یہ ادبی کارواں اپنی منزل کی طرف

برف کسی چٹان کی مانند جمی ہوئی تھی۔ سورج کی کرنیں پڑتے ہی یہ برف چاند کی طرح چمکنے لگتی اور دیکھنے والوں کی آنکھیں مہندیا جائیں، برف سے لدی ہوئی یہ چوٹیاں اور اس پر جھکا ہوا نیلا آسمان قدرت کا عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ دیکھنے والوں کا دل چاہتا کہ عمر بھر اس جگہ ڈیرا ڈال دے۔ درختوں کے نیم زرد پتے جھیل میں چھلانگ لگا کر بہہ جاتے پانی کے ریلے انہیں کناروں کی طرف دھکیل دیتے۔"

(اقتباس "شکارے کی موت")

"جب بھی ہیرا بائی کے گلشن میں کوئی نئی کلی چٹکنے لگتی تو اس کی مہک سونگھ کر کوٹھے کے اردگرد بھنورے بے اختیار منڈلاتے لگتے۔ ہیرا بائی کے زیر سایہ تربیت پانے والی رقاصاؤں کا رقص دیکھنے کا مزا ہی کچھ اور تھا۔ اکثر شہر کے باعزت اور شریف لوگ رات کی تاریکی میں اُجلے لباس پہن کر اس بزم میں آتے اور اس بزم کی شراب سے لطف اندوز ہوتے ...... رات کے اندھیرے میں وہ چاہے کچھ بھی کرلیں مگر سحر ہوتے ہی وہ اپنے چہروں پر عزّت اور شرافت کا نقاب پڑھا لیتے ...... پھر جگّا نے لڑکی کو پانچ ہزار روپے میں فروخت کر دیا جیسے وہ گائے بکری ہو۔ اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوا کہ جس عورت کو وہ بازار میں نیلام کرنے جا رہا ہے یہی عورت اس کی ماں ہے۔ یہی عورت اس کی بہن ہے۔ یہی عورت کل اس کی بیٹی ہوسکتی ہے — یہی عورت حوّا بنتِ حوّا ہے — یہی عورت آدم کے چمن کی ایک نازک کلی ہے — یہ وہی عورت ہے جس نے پیر پیغمبروں کو جنم دیا — یہ وہی عورت ہے جس نے حضرت عیسیٰؑ کو جنم دیا — یہی عورت سیتا کی طرح پاک اور پوترا اور مریمؑ کی طرح

اگر اُن کی منظر کشی کو اہمیت نہ دی جائے تو یہ ناانصافی ہوگی۔ ذیل میں چند افسانوں کی منظر نگاری ملاحظہ فرمائیں:

"اس جھیل کی گود میں سینکڑوں ہاوس بوٹ اور ہزاروں شکارے پناہ لئے ہوئے تھے۔ اس کے دونوں کناروں پر کھڑے ہاؤس بوٹ جھیل کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔ جھیل کے سینے میں دو چھوٹے چھوٹے جزیرے دل کے اندر ایک دل کی مثال تھے جس کے ایک ٹکڑے پر محکمہ سیاحت نے عالیشان ہوٹل تعمیر کروایا تھا تو دوسرے جزیرے پر بہت ہی خوبصورت باغ سیّاحوں کے لئے بنوایا تھا۔ یہ باغ "دل باغ" کے نام سے مشہور تھا جہاں اکثر سیّاح لوگ فرصت کے لمحات گزارتے جاتے اور یہاں کی خوبصورتی سے خوب لطف اندوز ہوتے ..... جھیل کے دوسرے کنارے پر اُونچے لمبے سفیدے کے درخت مستی میں جھومتے دکھائی دے رہے تھے ..... سڑک کے بائیں جانب دور تک پھولوں کی ایک چادر بچھی ہوئی تھی۔ جھیل کے دائیں جانب ایک بہت بڑی زیارت تھی جس کے سفید گنبد دُور سے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ جھیل اپنے شفاف پانی سے اس زیارت کے پاؤں دھو رہی ہو۔ اس کے سامنے والی پہاڑی پر کسی بہت بڑے قلعے کا کھنڈر موجود تھا۔ اس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا شو مندر بھی تھا۔ صبح و شام اس مندر کی گھنٹیوں کی آواز سے ساری وادی گونج اٹھتی ..... جھیل کے مغرب میں دُور تک پہاڑوں کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا تھا جس پر آج بھی سردیوں کی

"گُلاں نے اپنے برہنہ بدن پر کچھ رینگتا ہوا محسوس کیا۔ اس نے کروٹ بدلی تو دیکھا صاحب کا کھردرا ہاتھ اس کے برہنہ جسم پر کسی زہریلے ناگ کی طرح رینگ رہا تھا۔ اس نے اُٹھنے کی ناکام کوشش کی لیکن نشہ اپنا اثر دکھا چکا تھا۔ پلنگ کے نرم گدّوں پر اُسے عجیب سکون محسوس ہو رہا تھا اُس نے اپنے اعضاء تو ڈھکنے کی ناکام کوشش کی لیکن صاحب نے چادر کھینچ کر دور پھینک دی اور اس کے برہنہ جسم کو سہلانے لگا۔ وہ جذبات کی بھٹّی کو ہوس کی آگ سے گرمانے میں مصروف تھا۔ اس نے گلاں کے نازک ہونٹوں پر ہوس کی مہر ثبت کر دی۔ گلُاں کو لگا جیسے ایک ساتھ کئی زہریلے ناگ اس کے رُخساروں میں چھپ گئے ہوں۔ گلاں نے پھر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اجگر اپنے شکار کو کنڈلی مار چکا تھا۔ گلاں بے بس پنچھی کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

(اقتباس "ریلیف")

"یہ تب کی بات ہے جب چین نے دوست بن کر اس کے وطن کی پیٹھ میں دشمنی کا خنجر گھونپ دیا اور اچانک چین نے اس کے دیش پر جنگ مسلّط کر دی تھی۔ وہ اس وقت چالیس کے قریب تھا۔ اس میں وطن پر مر مٹنے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اس کے باپ نے تحریک آزادی میں حصّہ لیا تھا جب کرتار سنگھ کو جلیانوالہ باغ کا واقعہ سناتا تو اس کا خون کھول اٹھتا۔ اس کے بعد وہ کئی بار جیل بھی گیا تھا اور پھر اس کی آنکھوں نے لال قلعے پر ترنگا لہراتے

مقدس ہے اور نہ ہی ہیرا بائی کو احساس ہوا کہ وہ عورت ہونے کے
علاوہ ایک بیٹی کی ماں بھی ہے۔"

(اقتباس "طوائف")

" آفتاب اپنی آخری حاؤں کو چھوڑ رہا تھا۔ مُرغابیوں کا
ایک جھُنڈ جھیل کے اس کنارے سے اڑ کر اُس کنارے جا بیٹھا تمام
شکارے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ جھیل کے دونوں
طرف کناروں پر میونسپلٹی کے کھمبوں پر لگے بلب جگمگا رہے تھے۔
دُور تک روشنی کا ایک جال سا بچھا ہوا تھا۔ جھیل کا پانی بالکل
ساکت تھا جیسے دن بھر کا تھکا ماندا مسافر بے سدھ سو رہا ہو۔
(اقتباس "شکارے کی موت")

" چند لمحوں میں غضب ناک آوازیں آنے لگیں — بھاگو
بھاگو — پکڑو پکڑو — مارو مارو ایک دم پتھراؤ شروع
ہوگیا۔ ننھے ننھے پھول جیسے معصوم بچے بھگدڑ میں پیروں تلے
کچلے گئے۔ برسوں کی دوستی۔ محبت، بھائی چارگی اور امن واتحاد
کو لوگوں نے پاش پاش کر ڈالا۔ وہ شہر جو کبھی امن و آشتی کا گہوارہ
تھا، آج آگ میں جل رہا تھا۔ ہر طرف ایک قیامت بپا تھی۔
لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے تھے۔ شہر کی تمام
خشک زمین انسانی خون سے تر تھی۔

(اقتباس "گوشت کا ٹکڑا")

برگ خوف اور دہشت سے کانپتے سفیدے کے اشجار ــــ شرم سے سر جھکائے سب کے سب کوہسار ــــ پہاڑی والا وہ مندر جہاں شنکھ کی آواز بند ہے اور پتہ نہیں کئی دنوں سے کسی نے وہاں پر پرساد نہیں چڑھایا ــــ وہاں کے باغوں کے مُرجھائے ہوئے پھول سیاحوں کی وہ ٹولیاں غائب، زعفران کے پھولوں کی مہک کی جگہ اب زہر آلود دھتورے نے لے لی تھی۔ لڑکیوں کے رف اب آہوں اور چیخوں میں بدل گئے۔ ویران بہار، لہو لہان لڑکیاں ــــ لوگوں کے دلوں سے محبّت کے جہلم اور چناب، کی جگہ اب نکلتی نفرت اور خون کا دریا چارسُو ــــ جگہ جگہ خاکستر دکانیں۔

(اقتباس "سانجھی دھرتی")

"سردی اپنے پورے شباب پر تھی، ہوا کے سرد جھونکے سردی کا احساس دلا رہے تھے۔ صبح وشام سارے گاؤں میں دھند پھیل جاتی۔ فارم ہاؤس کے آس پاس کے درخت پتّوں کے لباس سے محروم ہو جاتے تھے۔ درختوں کی شاخیں ہوا کے سرد جھونکوں سے ایسے ہلتیں گویا ٹھنڈ سے کانپ رہی ہوں۔ فارم ہاؤس تک آنے والی پگ ڈنڈی پر نیلے گھاس کا ایک بھی تنکا موجود نہیں تھا۔ سامنے کے میدان میں بھیڑ بکریاں دل کی تسلّی کے لئے میدان کی سوکھی ہوئی گھاس پر مُنہ مار رہی تھیں۔ دور پہاڑیوں سے گڈریئے کی بانسری سے نکلتی تان جوان دلوں میں ہلچل مچا رہی تھی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا رامو نے گوپی کو آگ جلا کر دی تاکہ سردی سے محفوظ رہ سکے۔

(اقتباس "پتھّر کے صنم")

بھی دیکھا تھا۔ اس کے بعد سنتالیس کا بٹوارہ بھی اس کی گنہگار آنکھوں
نے دیکھا۔ جب انگریزوں نے بھارت ماں کی چادر کے دو ٹکڑے کر دئے
اور قتل و غارت شروع ہو گئی لیکن اس وقت بھی وہ اور کریم اسی گاؤں
میں پیار و محبّت سے رہے۔ ایک طرف لوگوں کے دلوں میں نفرت کی
جوالا بھڑک رہی تھی تو دوسری طرف اِس گاؤں کے لوگوں کے دلوں میں
محبّت کا چناب ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ...... گورچرن کو ابھی بھرتی
ہوئے تین ہی سال ہوئے تھے کہ وطن پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔ اس وقت
گورچرن دو ماہ کی چھٹی لیکر گھر آیا تھا جب کرتار نے سُنا کہ سرحد پر دشمن نے
حملہ کر دیا ہے تو اس نے فوراً اپنے بیٹے کو واپس جانے کے لئے کہا کہ "پُتر اس
وقت وطن نو تیری لوڑ ہے، تیرا مقصد صرف تنخواہ لینا ہی نہیں بلکہ اپنے وطن
دی حفاظت کرنا وی ہے۔ جا پُتر جا تیرا فرض تینوں بلا رہیا ہے۔" گورچرن
روتی بلکتی ماں کو چھوڑ کر محاذ پر چلا گیا... وہ دونوں اسلحہ ڈپوؤں سے
اسلحہ کے صندوق ڈھو کر مورچوں تک لے جانے لگے۔ یہاں تک کہ
ان کے کاندھے لہولہان ہو گئے لیکن ان کے دلوں میں حبّ الوطنی کا
جذبہ موجیں مار رہا تھا، وہ کئی دن تک فوج کی مدد کرتے رہے تب تک وہ
گھر نہیں آئے جب تک دیش کے جیالے سپاہیوں نے دیش کے دشمن
کو شکست نہ دے دی۔ (اقتباس "زخمی ہل")

"اسے کیا معلوم تھا کہ قُدرت کے یہ حسین مناظر اتنی جلدی ہم سے
روٹھ جائیں گے۔ وہ سوچنے لگا اِس شہر کا پانی بالکل خاموش اور
خوف سے ڈولتی کشتیاں ـــــ ویران ہاؤس بوٹ اور شکارے چناروں
کی ٹھنڈی اور میٹھی چھاؤں غائب ـــــ سہمے سہمے چناروں کے

میں گلاں کے کردار کے ساتھ مایوس نے پورا پورا انصاف کیا ہے۔ اسی طرح "زخمی ہل" کے کرتار سنگھ کے وطنی جذبات کا خوبصورتی سے اظہار کیا ہے۔ اُن کے باقی افسانوں "چوتھا کونہ"، "لہو کی مہندی"، "قدرت کا انصاف"، "گوشت کا ٹکڑا"، "ووٹ"، "جہیز"، "پولیس" اور "سوتن" میں بھی کہیں کہیں پختگی نظر آتی ہے اُنہوں نے واقعی ایک اچھّے ادیب کی نظر سے سماج کو دیکھا اور سماج سے اُبھرنے والے اچھّے اور بُرے نظریات کو صفحۂ قرطاس پر ابھارا ہے۔ بے شک مایوس اپنے ہم عصروں میں سب سے آگے ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ وہ تیسری پیڑی کے ادیبوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ مایوس کے مسودّے کا مطالعہ میرے لئے کسی تجربے سے کم نہیں۔ وہ ایک تجربہ کار ادیب ہے۔ اُس سے خطۂ پونچھ کے مستقبل میں بہت سی اُمیّدیں وابستہ ہیں۔ مجھے امیّد ہے کہ مایوس ان اُمیّدوں پر پورا اُترنے کی کوشش کرے گا۔

کے۔ کے کپور

ڈسٹرکٹ ایجوکیشن وپلاننگ آفیسر پونچھ

جنوری ۱۹۹۵ء

"تمہاری خطاؤں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ایک حقیر ذرّے نے آفتاب کو چومنے کی ناکام کوشش کی ہے..... ایک گندی نالی نے سمندر سے ٹکرانے کی جسارت کی ہے..... تمہارے گندے ہاتھوں نے ایک پاکیزہ آنچل کو چھونے کی خطا کی ہے..... ایک دیوانہ مالی نے کیکر کے درخت پر انگور کی بیل چڑھانے کا خواب دیکھا ہے..... ایک بھکاری نے مخمل پر ٹاٹ کا پیوند لگانے کی جرأت کی ہے۔ پھر بھی تم پوچھتے ہو تمہارا قصور کیا ہے۔ ——————

میرا قصور کیا ہے؟ کیا قصور ہے میرا؟ یہی کہ میں نے تمہیں تراشا ہے..... تمہیں تراشنے کا یہی صلہ ہے...... بولو..... بولو..... تم بولتی کیوں نہیں..... وہ زور زور سے مورتی سے سر ٹکرانے لگا۔ دفعتاً وہ رک گیا..... تم کیسے بھول سکتی ہو..... تم تو پتھر کی ہو، پتھر کی..... اور پتھرّ کبھی بولا نہیں کرتے۔ تم گوشت پوست کے انسان کی قدر کیا جانو..... تم میرے صنم نہیں ہو سکتے کبھی نہیں ہو سکتے۔ تم تو پتھرّ کے صنم ہو پتھرّ کے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا مورتی کے قدموں میں گر پڑا۔ (اقتباس "پتھرّ کے صنم")

پرویز مایوس کا شمار جدید دور کے صفِ اوّل کے ادبا میں ہوتا ہے۔ اُن کے افسانوں سے حقیقت اس طرح ٹپکتی ہے جس طرح چھتّے سے شہد۔ اُن کے افسانوں میں حبُّ الوطنی، بھائی چارگی، ہم آہنگی اور آپسی رواداری کی جو جھلک ملتی ہے وہ ایک ادیب کے وُسعتِ خیالات اور پختہ ذہن کی نشاندہی کرتی ہے۔ پرویز مایوس کے علامتی افسانے کسی حقیقت سے کم نہیں۔ "پتھرّ کے صنم" میں مایوس نے جس انداز سے گوپی کے کردار کو پیش کیا ہے وہ ایک پختہ ذہن ادیب ہی کر سکتا ہے۔ "ریلیف"

شکارے کی موت

کشمیر کی تاریخ جھیل ڈل کے بغیر کمّل نہیں ہوتی ۔ اس جھیل کا کشمیر سے جنم جنم کا رشتہ ہے ۔ اس کا نام تو جھیل دل ہونا چاہئے تھا۔ اس جھیل کا کشمیر میں وہ مقام ہے جو انسانی جسم میں دل کا ہے ۔ صدیوں پُرانی یہ جھیل اپنے سینے کے اندر کشمیر کی کئی کہانیاں چھپائے ہوئے ہے .... نیلے رنگ کی یہ جھیل دور تک پھیلی ہوئی تھی لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ بچاری بھی سکڑتی گئی ۔ یہ جھیل ہزاروں لوگوں کو روزی فراہم کرتی ہے .... مچھیرے مچھلیاں بیچ کر تو ہانجی لوگ شکارے چلا کر اپنی روزی چلاتے ہیں .... اس جھیل کی سبزیاں بھی کافی لذیذ تھیں ۔ سبزیوں میں لوگ خاص کر "ندرو" کو بے حد پسند کرتے .... اس جھیل کی گود میں سینکڑوں ہاؤس بوٹ اور ہزاروں شکارے پناہ لئے ہوئے تھے ۔ اس کے دونوں کناروں پر کھڑے ہاؤس بوٹ جھیل کی خوبصورتی میں غیر معمولی اضافہ کر رہے تھے ۔ جھیل کے سینے میں دو چھوٹے چھوٹے جزیرے دل کے اندر ایک اور دل کی مثال تھے جس کے ایک

ایک تاثر

افسانہ نگاری کے فن میں کرشن چندر جیسی ہستی نے سرزمین پونچھ کو مقصدِ حیات بنا کر بجا طور پر ہمارے سروں کو فخر سے بلند کیا ہے اور تقریباً چونسٹھ بین الاقوامی زبانوں میں خطۂ پونچھ کو متعارف کرایا ۔ منشی پریم چند کی وفات کے ساتھ ہی ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک نے جنم لیا اور پونچھ کے ایک جیالے نوجوان نے تحریک کا جھنڈا اپنے ہاتھ میں لیکر اس گمنام دھرتی کو برّصغیر کے نامور شاعروں ادیبوں اور فنکاروں کے ذہن تک پہنچایا افسانہ نگاری کے فن میں پریم چند سے لیکر کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو تک سلسلہ در سلسلہ افکار کی ترسیل مضمر ہے مگر کرشن چندر نے پونچھ کی پتھریلی زمین میں ایسی نمی ڈالی کہ ۱۹۴۷ء کے پُر آشوب دور کے بعد بھی افسانہ نگاری کا یہ سلسلہ نہ رکا بلکہ پرویز مایوس کی شخصیت وصورت میں فن کی کونپل نے جنم لیکر کرشن چندر اور ٹھاکر پونچھی کے خواب دیرینہ کو جلاء بخشی کیونکہ فن کبھی نہیں مرتا صرف لبادہ تبدیل کرتا ہے ۔ ۱۹۴۷ء کے بعد نوعِ بشر کے ذہنوں میں زبردست سیاسی، سماجی غیر یقینی اور اخلاقی اقدار کا فقدان اور گراوٹ پیدا ہوئی جس میں گوناگوں سلگتے مسائل اُبھر اٹھے ہیں جن میں پرویز مایوس فرقہ وارانہ تناؤ، بے کاری، غریبی، غنڈہ گردی، سیاسی آلودگی اور تہذیب و تمدّن کی گرتی ہوئی دیوار کے ساتھ لڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔

پرویز مایوس کے افسانوی مجموعے کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ عمر کے لحاظ سے نوخیز فنکار فکر کی پختگی کے ساتھ اپنے ارد گرد کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ دورِ حاضر کا انسان اگرچہ مریخ و زہرہ پر کمندیں ڈال رہا ہے اور ایفل ٹاور جیسی اونچی عمارتیں بنا کر بھی ذہنی طور اس قدر نیچے چلا گیا ہے کہ اس کی واپسی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے نفسا نفسی کے عالم میں آج کے انسان کا عکس "شکاری کی موت" میں ملتا ہے ۔

پرویز مایوس کی کاوش قابل قدر ہے اور اس ابھرتے ہوئے فنکار کیلئے بے ساختہ یہی دُعا دل سے نکل رہی ہے ۔ کہ "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"

دُعاگو: شیخ سجّاد حُسین (وارڈن گوجر بکروال ہوسٹل، پونچھ)

دیودار کی تھی ..... باپ کے مرنے کے بعد "غفارے" نے اس ہاؤس بوٹ کو نئے نام سے نوازا تھا۔ اس نے اس کا نام "گلفام" رکھا تھا۔ اس کے آباء واجداد یہی کام کرتے آئے تھے۔ ان کا سیّاحوں سے کافی گہرا رابطہ تھا۔ غفارا بھی اپنے باپ دادا کی طرح سیّاحوں کے ساتھ بڑے ادب وخلوص سے پیش آتا۔ تبھی تو ہر سال بہار کے موسم میں اس کے ہاؤس بوٹ پر "ہاؤس فُل" کا بورڈ آویزاں ہوتا آس پاس کے ہاؤس بوٹ والے اس کو حسد بھری نظروں سے دیکھتے اور سوچتے اس کے ہاؤس بوٹ میں ایسی کونسی خوبی ہے جو ہر سیّاح ادھر کا ہی رُخ کرتا ہے۔ وہ غفارے سے حسد کرنے لگے ..... غفارا بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا۔ چہرے پر سفید داڑھی اور سر پر سفید گول ٹوپی ہمیشہ پہن رکھتا ..... سردی ہو یا گرمی وہ ہر موسم میں فرن (کشمیری کُرتہ) پہن رکھتا۔ اس کی عُمر پچّاس سال کے قریب تھی۔ پھر بھی وہ تندرست تھا۔ اِس کی بیوی "پوشا" چالیس سال کے قریب تھی ... 'کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت خوبصورت تھی' والی مثال تھی اُس کی' اُسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ ضرور جوانی میں وہ حُسن کی ملکہ رہ چکی ہوگی۔ اب اس کے سِر میں چاندی کے سفید تار چمکنے لگے تھے۔ غفارے کی تین اولادتھیں' دو لڑکے ساجد اور ماجد' ایک چلبلی نازنین معصوم کمسن لڑکی "روشا" تھی۔ حال ہی میں اس نے بڑے بیٹے کی شادی بڑھے دھوم دھام سے رچائی تھی۔ تمام ہاؤس بوٹوں کو دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ کئی سیّاح بھی اس شادی میں شریک ہوئے تھے۔ انہوں نے بہت سے تحائف بھی دئے تھے ..... ساجد کی بیوی چاند کا ٹکڑا تھی۔ لمبے لمبے بالوں کی دو چوٹیاں پشت پر ڈالے ہوئے سر پر سکارف باندھ کر وہ جھیل میں کِھلے کنول کے پھول کی مانند حسین لگ رہی

ٹکڑے پر محکمہ سیاحت نے عالیشان ہوٹل تعمیر کروایا تھا اور دوسرے جزیرے پر
بہت خوبصورت باغ سیّاحوں کے لیئے بنوایا تھا۔ یہ باغ "دل باغ" کے نام سے
مشہور تھا جہاں اکثر سیّاح لوگ فرصت کے لمحات گزارنے جاتے تھے اور یہاں
کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتے...... جھیل کے دوسرے کنارے پر
اونچے لمبے سفیدے کے درخت مستی میں جھومتے دکھائی دے رہے تھے۔ سڑک
کے بائیں جانب دُور تک پھولوں کی ایک چادر بچھی ہوئی تھی۔ جھیل کے دائیں جانب
ایک بہت بڑی زیارت تھی جس کے سفید گنبد دُور سے صاف دکھائی دے رہے
تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ جھیل اپنے شفاف پانی سے اس زیارت کے پاؤں
دھو رہی ہے۔ اس کے سامنے والی پہاڑی پر کسی بہت بڑے قلعے کا کھنڈر موجود
تھا۔ اس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا شِو مندر بھی تھا۔ صبح و شام اس مندر
کی گھنٹیوں کی آواز سے ساری وادی گونج اٹھتی۔ جھیل کے مغرب میں دُور تک
پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جس پر آج بھی سردیوں کی برف کی چٹان کی
مانند جمی ہوئی تھی۔ سورج کی کرنیں پڑتے ہی یہ برف چاندی کی طرح چمکنے
لگتی اور دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا جاتیں۔ برف سے لدی ہوئی یہ چوٹیاں
اور اُس پر جھکا ہوا نیلا آسمان قُدرت کا عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ دیکھنے
والوں کا دل چاہتا کہ وہ عُمر بھر اسی جگہ ڈیرا ڈال دے.... درختوں کے نیم
زرد پتّے جھیل میں چھلانگ لگا کر تیر رہے تھے۔ پانی کے ریلے انہیں کناروں
کی طرف دھکیل دیتے۔ ہاؤس بوٹوں کی قطار میں کھڑے ہاوس بوٹوں میں ایک
ہاؤس بوٹ "غفارے" کا بھی تھا جو کہ بیس سال قبل اُس کے باپ نے جھیل
میں اتارا تھا۔ یہ کافی پُرانا دکھائی دے رہا تھا۔ اس میں لگی ہوئی تمام لکڑی

تھا کہ پوشا نے اس کے کان میں کچھ کہہ دیا تو وہ چونک پڑا۔ وہ جلدی جلدی اُٹھا اور ہاؤس بوٹ کے ساتھ بندھے شکارے کی رسّی کھول کر چپّو چلاتا ہوا جھیل کے کنارے کنارے بازار کی طرف روانہ ہوگیا۔ آج اس کے بازوؤں میں پھر سے طاقت آگئی تھی۔ پوتے کے آنے سے وہ اپنے آپ کو جوان محسوس کر رہا تھا۔ ساجد اپنے شکارے کو ہاؤس بوٹ سے باندھ کر سیدھا اندر داخل ہوگیا۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو دیکھنے زونی کے کمرے میں پہنچا۔ ساجد، زونی کے سرہانے بیٹھا زونی سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہا تھا ـــــــ ساجد نے اپنے بیٹے کو گود میں اٹھایا۔ اسے عجیب سی گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بڑے غور سے اپنے بیٹے کے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو اپنا ہاتھ ساجد کے گلے میں پڑے ہوئے تعویذ کی طرف بڑھا رہا تھا اچانک تعویذ ساجد کے گلے سے ٹوٹ کر زمین پر آگیا۔ ساجد کو کافی ناگوار گذرا کیونکہ ساجد یہ تعویذ قریب کی زیارت کے بابا سے لایا تھا۔ وہ اس تعویذ کا بڑا احترام کرتا تھا۔ وہ بیٹے کی اس حرکت پر سخت مایوس ہوا پھر اس نے بیٹے کو زونی کی گود میں ڈال دیا اور خود بغیر کچھ کہے ہی کمرے سے باہر نکل گیا ـــــ غفارا ہاؤس بوٹ میں داخل ہوا اور بازار سے لائی ہوئی مٹھائی اپنے پڑوسیوں اور ہاؤس بوٹ میں ٹھہرے ہوئے سیّاحوں میں مٹھائی بانٹنے لگا۔ غفارا بے حد خوش تھا جیسے کوئی انمول خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو

.... وقت کا دریا رفتہ رفتہ بہتا گیا... سیّاح آتے رہے اور پنچھیوں کی طرح اڑ جاتے رہے... جھیل کا پانی بڑھتا اور گھٹتا رہا... بہار نے خزاں کو شکست دے کر اپنی فتح کا اعلان کر دیا۔ اب شدّاد

تھی۔ جیسے کشمیر کی خوبصورتی اس میں سمٹ آئی ہو۔ شاید اسی لئے گھروالوں نے
اس کا نام "زونی" رکھا تھا...... ساجد اور ماجد دونوں اپنے اپنے شکارے
چلایا کرتے تھے۔ کیونکہ اب غفارے کے ناتواں بازوؤں میں اتنی طاقت نہیں
رہی تھی کہ وہ پھر چپّو چلا سکتا۔ ساجد اور ماجد دن بھر سیّاحوں کو اپنے شکارے
میں بٹھا کر پوری جھیل کی سیر کراتے۔ بعض اوقات سیّاح لوگ خوش ہو کر انہیں
کوئی قیمتی چیز انعام کے طور پر دیتے۔ کبھی کبھی تو وہ دونوں اتنی دور نکل جاتے کہ
شام کو گھر واپس نہیں لوٹ سکتے۔ تب غفارے کو تشویش ہوتی۔ وہ سوچتا نہ جانے
اُس کے بیٹے کہاں ہونگے لیکن اُسے یقین تھا کہ وہ جہاں بھی ہونگے صحیح سلامت
ہونگے کیونکہ اسنے آج تک کبھی بھی جھیل کی نافرمانی نہیں کی تھی اس لئے جھیل نے
اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ جب پہاڑوں کی برف پگھلنے لگتی تو جھیل کا پانی
پاس والی سڑک کے اوپر سے گذر کر دور تک میدانوں میں پھیل جاتا۔ تب
غفارا اپنا کوئی بھی شکارا پانی میں اُتارنے کے بجائے کنارے پر ہی باندھ رکھتا
اور جب پانی اُترنے لگتا تو غفارا اپنا شکارا دوبارہ پانی میں اُتار دیتا ———
آج غفارا کافی خوش نظر آرہا تھا۔ جب اُس کی بیوی پوشا نے اسے بتایا کہ
ساجد باپ بن گیا ہے، تب سے ہی اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔
اس کے دل میں خوشی سے ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے
خیالات جنم لینے لگے، وہ دور کی سوچ رہا تھا۔ وہ اپنے پوتے کا نام "شداد"
رکھے گا۔ وہی "شداد" جس نے جنّت تعمیر کی تھی، پھر وہ بڑا ہو جائے گا۔ وہ
"شداد کے لئے نیا شکارا بنا کر لائے گا... وہ ضرور خاندان کا نام روشن
کرے گا، وہ اس کشمیر کو جنّت بنا دے گا۔ وہ انہی خیالوں میں ڈوبا ہوا

جس میں پہلے ہی کچھ غیر ملکی سیّاح نیم دراز ہو کر بیٹھے تھے ـــــ شدّاد وہاں سے اٹھ کر سیّاحوں کے پاس آگیا۔ "بیٹے! تمہارا نام کیا ہے۔" ایک سیّاح نے اُسے چاکلیٹ دیتے ہوئے پوچھا۔ "میرا نام شدّاد ہے"۔ اُس نے چاکلیٹ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا... اچانک دوسرا سیّاح زوردار آواز میں غفارے سے مخاطب ہوا۔ "بابا ان شکاروں کی بدولت ہی کشمیر میں رونق ہے۔ اگر کبھی یہ شکارے نہ رہے تو کشمیر کی یہ حسین وادی کتنی ویران ہو جائے گی۔" غفارے کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو گیا۔ اُس کا دل چاہا کہ چپّو اُس سیّاح کے منہ پر دے مارے جس نے ایسی منحوس بات اپنے گندے منہ سے کہی تھی۔ غفارے نے سوچا ضرور کوئی دشمن ہے جسے کشمیر کی خوبصورتی دیکھی نہیں جاتی۔ وہ خاموش بیٹھا چپّو سے پانی کاٹتا رہا۔ شدّاد، سیاح کی گود میں سے اٹھ کر غفارے کے پاس آ گیا۔ غفارا گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ اس سیّاح نے ایسی بات کیوں کہی ہے۔ وہ اپنے ہاؤس بوٹ کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک غفارے کی نظر شدّاد کے ہاتھوں پر پڑی۔ وہ چونک پڑا جس نے اپنے ہاتھوں میں لکڑی کو سوراخ کرنے والا اوزار پکڑا ہوا تھا۔ غفارے نے اس سے دریافت کیا تو شدّاد نے بتایا کہ یہ کھلونا اسے اسی سیّاح نے دیا تھا جس کی گود میں وہ دن کو بیٹھا تھا۔ یہ سنتے ہی غفارے کے کان کھڑے ہوئے۔ اس کے دل میں عجیب قسم کے شبہات پیدا ہوتے لگے۔ وہ سوچنے لگا کہ کہیں وہ سیّاح میرے شکارے میں کوئی سوراخ تو نہیں کر گیا۔ پھر اس نے سوچا وہ بھی تو اسی شکارے میں بیٹھا تھا، اگر شکارا ڈوب جاتا تو وہ سیّاح بھی ساتھ میں ڈوب جاتے ـــــ غفارے نے شدّاد

دو سال کا ہو چکا تھا۔ غفارا ہر وقت اُسے اپنے شکارے میں سیر کراتا کیونکہ آگے
چل کر اسے بھی یہی کام کرنا تھا۔ اس لئے غفارا اسے سب کچھ سکھا دینا چاہتا
تھا تاکہ اسے کوئی مشکل پیش نہ آئے ـــــ شدّاد بے حد خوبصورت تھا۔
سڈول جسم، گول سفید چہرہ، نیلی نیلی آنکھیں، سر پر سنہری بال (فرن) میں
ملبوس، وہ اور بھی خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔ شکارے میں بیٹھے سیّاح
اُس کی توتلی زبان سے باتیں سن کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ وہ بار بار دادا
کی نقل اُتارتا ـــــ سلام شاب، سلام شاب کہہ کر انہیں ہنساتا...
شدّاد کی پھوپھی "روشا" اسے ہر وقت سینے سے لگانے کے لئے بے قرار
رہتی.... چاچا ماجد تو جب بھی اُسے اپنے شکارے میں گھمانے کے لئے لے
جاتا تو واپسی پر اس کے ساتھ ڈھیر سارے کھلونے ہوتے۔ شدّاد پانچویں سال
میں قدم رکھ چکا تھا۔ آج پھر وہ اپنے چاچا ماجد کے ساتھ شکارے میں بیٹھ
کر دُور نکل چکا تھا۔ ماجد نے اپنے ہاؤس بوٹ کو دُلہن کی طرح سجایا ہوا
تھا۔ دیکھنے والے کا دل کرتا کہ ہمیشہ اسی شکارے میں بیٹھا رہے ـــــ جھیل کے
جھلمل کرتے پانی پر سورج کی کرنیں پڑتے ہی پانی چاندی کی طرح چمکنے لگتا۔
دُور تک سینکڑوں شکارے جھیل کی آغوش میں تیر رہے تھے۔ جھیل میں تیر رہی
مرغابیاں شکارے کو اپنی جانب آتے دیکھ کر اونچی اڑان بھر کر دُور کی اونچے
سفیدے کی چوٹی پر بیٹھ جاتیں۔ شکاروں میں بیٹھے سیّاح اس خوبصورت
منظر کو اپنے کمرے کی زینت بنا لیتے ـــــ ماجد نے شکارے کا رُخ واپس
اپنے ہاؤس بوٹ کی طرف موڑ دیا ـــــ غفارے نے ہاؤس بوٹ کی کھڑکی
سے شدّاد کو پوشا کے ہاتھوں سے پکڑا اور شکارے کے ایک سرے پر بٹھا دیا

ہے۔ یہ غلط بات ہے، میں یہ نہیں مانتا... ساجد نے پیالی میں بچی ہوئی چائے دُور پھینکتے ہوئے کہا اور اُٹھنے کی کوشش کی تو غفارے نے گرج دار آواز میں کہا۔" ساجد! ہوش میں آؤ۔ بیٹا تم نہیں جانتے، یہ غیر ملکی سیاح ہیں۔ یہ کشمیر کی خوبصورتی سے جلتے ہیں اور نہ جانے کب سے ان کی نظر کشمیر پر لگی ہوئی ہے۔ ایک بار پہلے بھی کشمیر کے شکارے اسی طرح ڈوبنے لگے تھے۔ لیکن جب اِن لوگوں پر نظر رکھی گئی تو معاملہ ٹھیک ہو گیا۔ زمانے کی ہوا بدل چکی ہے۔ آجکل دُشمن سیّاح بن کر کشمیر آتے ہیں اور ہمارے سادہ لوح کمسن بچّوں کو بہکاتے ہیں۔ غفارا شفقت آمیز لہجے میں ساجد کو سمجھانے لگے... ساجد نے اثبات میں سر ہلا دیا..... لیکن بابا! ان لوگوں کی کشمیر سے ــــ کشمیر کے چناروں سے ــــ کشمیر کے شکاروں سے کیا دشمنی ہے۔ وہ کیوں جلتے ہیں کشمیر کی خوبصورتی سے۔ ساجد نے غفارے کی چلم پھونکتے ہوئے کہا۔ خُدا جانے بیٹا ــــ سب زمین کے اس خوبصورت ٹکڑے کے لئے ہو رہا ہے۔ ابھی تو برف بھی پگھلنے والی ہے اگر شکارے ڈوبنے کا سلسلہ یونہی چلتا رہا تو خُدا جانے کیا ہو گا۔ ساجد (فرن) سے ہاتھ باہر نکال کر آسمان کی طرف اُٹھاتے ہوئے بولا۔ پھر غفارے نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ جو بات میں نے کہی وہی کرو اور کوئی راستہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ پھر تینوں سیڑھیاں اُتر کر ہاؤس بوٹ میں داخل ہو گئے... غفارا بہت خوش تھا کیونکہ جلد ہی اس جھیل میں ایک اور شکارا اُترنے والا تھا۔ غفارا بڑھئی کو شدّاد کے شکارے کے لئے ایڈوانس بھی دے آیا تھا۔ اور اسی کے ساتھ ماجد کی شادی کی بات چیت چل رہی تھی ــــ ساجد تھکا ماندہ شکارا لے کر واپس گھر آ رہا

سے کہا کہ یہ اچھّا کھلونا نہیں ہے وہ اسے پھینک دے تو دادا اُس کو بازار سے
نیا کھلونا لاکے دے گا۔ لیکن لاڈ پیار سے بھلا شداد کب ماننے والا تھا۔ اس نے
صاف انکار کر دیا۔ آخر کار شداد کی ضد کے آگے غفارا ہار گیا ـــــ غفارا
چٹائی پر بیٹھا کانگڑی سے انگارے نکال کر چلم میں ڈال رہا تھا۔ کئی دنوں تک
وہ اسی کشمکش میں مبتلا رہا۔ آخر کار اس نے خُدا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔
آفتاب اپنی آخری حدّوں کو چھو رہا تھا۔ مرغابیوں کا ایک جھنڈ جھیل کے
اس پار سے اڑ کر دوسرے کنارے جا بیٹھا۔ تمام شکارے اپنے اپنے گھروں کو
لوٹ رہے تھے۔ جھیل کے دونوں کناروں پر میونسپل کمیٹی کے کھمبوں پر لگے ہوئے
بلب جگمگانے لگے تھے۔ دور تک روشنی کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ جھیل
کا پانی بالکل ساکت تھا جیسے دن بھر کا تھکا ماندہ مسافر بے سدا سویا ہوا ہو
۔۔۔۔ ساجد اور ماجد غفارے کے ساتھ اپنے ہاؤس بوٹ کی چھت پر بیٹھے
ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ تینوں سنجیدہ ہو کر
کچھ سوچ رہے تھے۔۔۔۔ بابا ان پانچ شکاروں کے بارے میں کچھ معلوم
ہوا جو پچھلے دنوں ڈوب گئے تھے؟ ۔۔۔۔ نہیں بیٹا! ابھی تک تو کچھ پتہ
نہیں چلا۔ غفارے نے حقّے کی نال مُنہ سے باہر نکالتے ہوئے کہا۔ ۔۔ بابا
اس بارے میں ضرور کچھ سوچنا پڑے گا ورنہ ماجد نے دانتوں سے لُواس
(روٹی) کاٹتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر چُپ رہنے کے بعد غفارا دونوں سے
مخاطب ہوا۔۔۔۔ "بیٹا تم اپنے تمام ساتھیوں سے کہو کہ وہ تمام غیر ملکی سیّاحوں
پر نظر رکھیں۔ یہ سنتے ہی ماجد بھڑک اُٹھا بابا آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔
وہ لوگ تو کشمیر کی سیر کرنے آتے ہیں، ان سے تو ہماری روٹی روزی ملتی

گیا۔ غفارا، ساجد کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ روشا، شدّاد کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولی: "بابا! بچّہ ہی تو ہے کھیلنے دو۔ پھر بچّے کیسے سوراخ کر سکتے ہیں؟ یہ تو ان شکاروں کے محافظ ہیں۔" پھر سب اُٹھ کر سونے کے لئے چلے گئے۔ زونی کھانے کے برتن صاف کرنے میں مصروف تھی۔ اچانک اُسے یاد آیا کہ کل جو شکارا ڈوبا تھا، پرسوں رات بچّے ہاتھ میں اوزار لئے کچھ کر رہے تھے۔ پھر اس نے سوچا اگر وہ یہ بات سب کو بتا دے گی تو سب شدّاد کو پیٹیں گے۔ شدّاد اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ پھر اس نے سر کو زور سے جھٹک دیا۔ نہیں نہیں! میرے شدّاد کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گی چاہے کشمیر کے سارے شکارے ڈوب جائیں، لیکن اس کی اولاد پر آنچ نہیں آئے گی۔ آخر ماں کا دل تھا ——— آفتاب سامنے والی پہاڑی سے نمودار ہو رہا تھا۔ اس کی سنہری کرنیں کھڑکیوں کے سوراخوں سے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ ساجد نے کروٹ بدلی تو اس کی آنکھوں پر کرنیں پڑتے ہی ساجد نے آنکھیں کھول دیں۔ اپنا آپ سنبھالا۔ دوسری چٹائی خالی پڑی تھی۔ ماجد نہ جانے کب کا اٹھ چکا تھا ——— آج انھیں نسیم باغ کے گیسٹ ہاؤس جانا تھا اور ان سیّاحوں کو لے آنا تھا جنھیں وہ کل وہاں چھوڑ آیا تھا۔ پانی آج اپنی سطح سے کافی اوپر تھا۔ لگتا ہے برف پگھلنے لگی ہے، پانی بڑھ گیا ہے۔ ماجد، ساجد سے مخاطب ہوا۔ "ہاں! ہاں! شکارا جلدی نکالو۔ اگر بابا نے دیکھ لیا کہ پانی چڑھ گیا ہے تو وہ ہمیں واپس بلا لائے گا اور ادھر سیّاح ہمارا انتظار کرتے رہ جائیں گے۔ شدّاد جو اس ہاؤس بوٹ کی کھڑکی سے چھپ کر دیکھ رہا تھا، ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ کھیلنے کے لئے نکل گیا ——— غفارے نے ہاؤس بوٹ سے باہر نظر دوڑائی تو اسے پانی معمول سے

تھا کہ اچانک اُن کی نظر شدّاد پر پڑی جو اپنے دوستوں کے ہمراہ کنارے پر عجیب کھیل کھیل رہا تھا۔ ساجد حیرت زدہ نظروں سے انھیں دیکھنے لگا کیونکہ ان بچّوں کے ہاتھوں میں لکڑی کو سوراخ کرنے والے اوزار تھے اور وہ سب ایک بڑے چنار کو سوراخ کرنے میں مصروف تھے۔ ساجد غصّے سے لال پیلا ہو گیا اور زور سے چلّایا: "ارے حرام زادو! یہ کیا کر رہے ہو؟" آواز سنتے ہی تمام لڑکے اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ شدّاد بھی سہما ہوا اپنے ہاؤس بوٹ کی طرف بھاگا ـــــ غفارا، روشا اور زونی کے درمیان بیٹھا کچھ باتیں کر رہا تھا۔ روشا نمدے پر کچھ کشیدہ کاری کر رہی تھی۔ اُس نے نمدے پر ایک خوبصورت کنول کا پھول بنایا تھا۔ ساجد کی آواز پر سب چونک پڑے۔ روشا کی آری نمدے پر چلتے چلتے رُک گئی۔۔۔ بابا او بابا۔۔۔ ارے ہم یہاں بیٹھے ہیں، کیوں چلّا رہا ہے؟ ساجد نے غفارے کو ساری بات سنائی۔۔۔ شدّاد دادی کی گود میں سہم کر بیٹھا ہوا تھا۔۔۔ اس دن آپ کہہ رہے تھے نا کہ غیر ملکی سیّاحوں پر نظر رکھو لیکن ہمارے ان بچّوں پر کون نظر رکھے گا۔ ساجد، شدّاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: "بابا کہیں یہ کام ان شیطانوں کا تو نہیں ہے؟" "کیا مطلب؟" غفارا حیران ہو کر بولا: "یہی کہ گھر کو جب بھی آگ لگی ہے تو گھر کے چراغ سے ہی لگی ہے"۔ ساجد جلے بھلے لہجہ میں بولا: "ہو سکتا ہے یہ سب مل کر شکاروں میں شگاف کرتے ہوں"۔ ساجد دانت پیستے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ارے نہیں بیٹے! تو خواہ مخواہ ان معصوم بچّوں پر شک کر رہا ہے۔ یہ تو کشمیر کا مستقبل ہیں ـــــ کشمیر کی تقدیر ہیں ـــــ کشمیر کا سرمایہ ہیں یہ سادہ لوح بچّے ایسا نہیں کر سکتے۔" غفارا، شدّاد کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "ہاں ہاں! اپنا بچّہ ہے نا، اس لئے۔ اپنے بچّوں کا قصور کون مانتا ہے ـــــ ان کو کون بُرا کہتا ہے۔ شیطان بھی پہلے فرشتہ تھا۔" یہ کہہ کر ساجد غصّے میں باہر نکل

پریشان ہوا تھا۔ شام تک جب ساجد اور ماجد گھر نہیں لوٹے تو اسے کافی تشویش ہوئی۔ اس نے اپنا ہاؤس بوٹ جھیل کے دوسرے کنارے لے جانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ جھیل میں پانی بڑھ جانے سے کنارے کا کچھ حصّہ کٹ گیا تھا۔ اس نے ہاؤس بوٹ کنارے سے کھول کر اس کا رُخ دوسرے کنارے کی طرف کر دیا وہ درمیان سے گذر رہا تھا کہ اچانک پوشانے اُسے زور سے آوازیں دیں ـــــ ہم لُٹ گئے! کیا ہوگا۔ ہاؤس بوٹ میں پانی بھرنے لگا ہے۔ کیا؟ غفارے کا ماتھا ٹھنکا۔ اس کو سوچنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ کام شدّاد اور اس کے دوستوں کا ہے۔ ساجد ٹھیک ہی کہتا تھا گھر کو آگ ہمیشہ گھر کے چراغ سے لگتی ہے۔ اس نے ہاؤس بوٹ کنارے کی طرف موڑا لیکن پانی نے اسے اتنی مہلت نہ دی۔ وہ سب مدد کے لئے لوگوں کو پکارنے لگے ـــــ "سُبحانہ، نُورا، جمالا، سلامہ۔۔۔ سب نے اپنے ہاؤس بوٹوں کا رُخ غفارے کے ہاؤس بوٹ کی طرف موڑ دیا۔ لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی ـــــ آہستہ آہستہ ہاؤس بوٹ ڈوبنے لگا۔ پوشا، روشا زور زور سے چلّا رہی تھیں۔ "بچاؤ، بچاؤ" لیکن زونی اپنے بیٹے شدّاد کو پکار رہی تھی۔ پھر سب کی آواز پانی میں ڈوبتی چلی گئی۔ اس طرح جھیل نے اپنے سینے میں ایک اور کہانی دفن کر لی۔

زیادہ لگا۔ وہ پچھتانے لگا کہ ساجد اور ماجد ایسے حالات میں گھر سے کیوں نکلے۔ آج اس نے پہلی بار جھیل کی نافرمانی کی تھی ـــــ ساجد اور ماجد اپنے ہاؤس بوٹ سے کافی دوٗر نکل چکے تھے۔ شکارا ایسی جگہ سے گذر رہا تھا جہاں بالکل ویران تھا۔ دوٗر تک کوئی شکارا یا ہاؤس بوٹ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ساجد شکارے کے ایک سرے پر بیٹھا تھا اور ماجد دوسرے سرے پر چپّو سے پانی کاٹ رہا تھا۔ اچانک ساجد کو محسوس ہوا کہ شکارا کچھ بھاری ہو گیا ہے اسے اپنے پاؤں ٹھنڈے لگنے لگے تو اس نے تختے کے نیچے ہاتھ ڈالا تو حیران رہ گیا۔ شکارے میں پانی بھر گیا تھا۔ ساجد نے ایک سوراخ پر ہاتھ رکھا تو پانی کم نہیں ہوا۔ ماجد کو چپّو منوں بھاری لگ رہا تھا۔ جب ساجد تھک جاتا تو ماجد شکارے سے پانی باہر نکالنے لگتا۔ ماجد نے دوسرے سوراخ پر ہاتھ رکھا تھا پانی تیسرے سوراخ سے اندر داخل ہو گیا۔ دونوں پانی نکال نکال کر نڈھال ہو چکے تھے۔ شکارے میں بے حساب چھوٹے چھوٹے سوراخ موجود تھے۔ وہ دونوں حیران تھے کہ یہ سوراخ کیسے ہو گئے؟ کس نے کئے؟ پھر ساجد کو شدّاد کا خیال آیا تو اُسے اپنے تمام سوالوں کا جواب مل گیا۔ اس نے سوچا آج گھر پہنچ کر وہ اس کی خبر لے گا۔ پانی شکارے میں بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ دونوں بے بس تھے۔ انھوں نے زور زور سے مدد کے لئے لوگوں کو پکارا لیکن اُن کی آوازیں پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس لوٹ آتیں۔ اچانک انھیں دور سے ایک شکارا اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ خوشی سے اور چلانے لگا۔ شکارا پانی سے پوری طرح بھر چکا تھا۔ رفتہ رفتہ دونوں جھیل کی آغوش میں سماتے چلے گئے ـــــ ادھر غفارا نماز پڑھ کر اٹھا تو تسبیح اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر آ گری اور دانے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ غفارا گھبرا گیا۔ وہ کافی

چوتھا کونہ

اس بڑے پہاڑ پر چیڑھ کے گھنے درختوں کے درمیان یہ اکیلا مکان "دینو" کا تھا۔ ہر مکان کی طرح اس کے بھی چار کونے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چار دیواریں تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ایک چھت تھی۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اسے ہم مکان نہیں سکتے کیونکہ مکان تو بڑا اور آٹھ دس کمروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ تو دینو کا ٹھارا ہے ٹھارا۔ ۔ ۔ ۔ جو پتھر اور مٹی سے بنایا گیا۔ چار دیواروں پر دو عدد لمبی لمبی کڑیا جن کا وزن نیچے لگے ہوئے تھموں پر تھا۔ ۔ ۔ کڑیوں پر چند بالے۔ ۔ ۔ اُن پر چیڑھ کی چھوٹی چھوٹی لکڑیاں چالیوں کی شکل میں بکھیر کر ڈالی گئیں۔ اُن پر "سمتھر" "کینتھی" ڈالنے کے بعد "لادی" یعنی مٹی ڈالی گئی پھر لکڑ کی "پیچڑ" سے مٹی کو زور زور سے دبایا جس سے مٹی اپنی جگہ جم گئی۔ ۔ ۔ ۔ پیچھے کی جانب "بلیوں" میں دو عدد "پرنالے" چھت کا پانی باہر نکالنے کے لئے لگائے گئے تھے۔ دونوں طرف سے ٹھارے کی "بلیوں" کا جھکاؤ زمین کی طرف تھا جو ترچھی بارش سے ٹھارے کی دیواروں کو محفوظ رکھتی تھیں پھر اس ٹھارے کو گارے سے لپائی کی گئی۔ ۔ ۔ ۔ ٹھارے کی بائیں جانب ایک چھوٹی سی "بانڈی" جس کے اندر دائیں جانب ایک "مڑو" جس میں چند مُرغے اور مُرغیاں رہتی تھیں" بانڈی" جس کے اندر ایک بھینس جو کہ پکّا چار سیر دودھ ایک وقت دیتی تھی۔ ایک گائے، ایک بچھڑی چار عدد بھیڑیں ۔ ۔ ۔ ایک جوڑی بیل الگ الگ کھونٹوں پر بندھے ہوئے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بھاؤ

اری کملا بہن ! سنا تم نے سونے کا بھاو کم ہو گیا ہے
اری بملا بہن ! اونچا اڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔
سورج کی دھوپ سے موم کے پنکھ پگھل جائیں گے۔

کیوں بملا بہن ! تمہیں خوشی نہیں ہوئی
کا ہے کی خوشی، سونے کا بھاو کم ہو گیا تو کیا ہوا۔ لڑکوں
کا بھاو تو بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

بھی خالی پڑا تھا۔ پانچ سال کے بعد یہ کونہ نوری کے آنے سے پُر ہو گیا۔ اور اب وہی کونہ "پھولاں" کے چلے جانے سے پھر ویران ہو گیا تھا..... پوہ کا سرد مہینہ تھا..... درخت پتّوں کے لباس سے محروم ہو چکے تھے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے درخت کی شاخیں یوں ہلتیں گویا ٹھنڈ سے کانپ رہی ہوں..... نیزوں پر برف نے اپنی سفید شال پھیلا دی تھی..... ابر کے ٹکڑے بار بار آفتاب کو اپنی چادر میں چھپا لیتے۔ آفتاب دھرتی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ چیڑ کے پیڑوں کی چوٹیوں پر کوّے کائیں کائیں سے اپنی تشنگی ظاہر کر رہے تھے..... دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑوں پر دُھند چھا گئی اور زور کی بارش شروع ہو گئی..... ٹھارے کے اندر گھپ اندھیرا تھا..... نوری نے اٹھ کر چولہے میں سے چیڑ کی "دینی" سلگائی اور اُس سے چمنی جلائی..... چمنی کی لو سے ٹھارے میں روشنی پھیل گئی......
نوری کا سانولا چہرہ......سر پہ چھوٹی چھوٹی پنڈیاں چوٹی کی شکل میں پیچھے کی طرف بندھی ہوئی تھیں۔ کانوں میں چاندی کے بڑے بڑے بالے... میلی سی شلوار قمیض میں ملبوس جس سے دھوئیں کی بدبو نکل کر ارد گرد پھیل جاتی.... نوری نے اپنی ٹانگیں سیکڑ لیں اور ٹھڈی گھٹنوں پر رکھ کر ٹانگوں کو باہوں میں بھینچ لیا اُس کی ماں "ریشما" بیمار پڑی کھاٹ پر کروٹیں بدل رہی تھیں۔ کبھی کبھار وہ کھانستی تو سارا ٹھارا گونج اٹھتا۔ اُس کا شوہر دینو اس کے لئے شہر دوائی لانے گیا تھا..... بارش نے نہ رُکنے کی قسم کھائی تھی..... اچانک پانی کے چند قطرے نوری کے سر پہ گرے تو اس نے مایوس کن نگاہوں سے چھت کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "بس تیری کمی باقی تھی... پانی چھت سے ٹپک رہا تھا۔ وہ تھوڑا ادھر کھسک گئی۔ وہ خاموش نہ جانے کن خیالوں کے گرداب میں ڈوب گئی..... اُسے وہ دن یاد آ گئے جب بارشوں میں ٹھارے کی چھت ٹپکنے

ٹھارے کے آگے وسیع آنگن جس میں ایک طرف گھاس کی گھاڑی اور مکئی کے "کرٹب" کی ایک لمبی لڑی بانڈی کے ساتھ والی دیوار سے جڑی ہوئی تھی..... دوسری طرف کچھ لکڑیوں کا ڈھیر جو کہ دینو نے سابقہ سیلاب میں دریا سے پکڑی تھیں..... ایک ٹھارا..... ایک دروازہ..... دو کھڑکیاں..... ایک آنگن..... دروازے کے بائیں جانب مٹی کا ایک "تندور" جس میں کبھی کبھار "ریشما" روٹیاں لگاتی تھی..... گھاس کی گھاڑی پر چند چوزے بیٹھ کر دھوپ کا مزا لے رہے تھے..... دور سے یہ سب کچھ بڑا دلکش لگ رہا تھا..... یہی سب کچھ ان پہاڑی لوگوں کا اثاثہ تھا۔ صدیوں سے چلی آ رہی تہذیب کو کیسے ترک کر دیتے یہ لوگ..... یہ سب کچھ تو اُن کی شناخت تھی..... انہوں نے اپنے تشخّص کو بحال رکھا تھا..... دینو کے گھر کا "چوتھا کونہ" کئی بار اُجڑا اور کئی بار بسا..... پہلی بار یہ کونہ اس وقت اُجڑا جب دینو کے پردادا کو موت کے ظالم پنجوں نے آدبوچ لیا..... اب اس کے گھر میں دادا، دادی، اور باپ رہ گیا تھا لیکن جلد ہی یہ کونہ اس کی ماں کے آنے سے پھر آباد ہو گیا۔ پھر سے اس گھر میں خوشیاں اُچھل کود کرنے لگیں۔ لیکن خوشیوں نے جلد ہی اپنا ڈھیرا وہاں سے اٹھا لیا..... دوسری بار یہ کونہ تب خالی ہوا جب اُس کا دادا اس دُنیائے فانی سے رحلت کر گیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اُس نے یہاں جنم لیا پھر ایک بار یہ کونہ آباد ہو گیا..... لیکن اس خاندان کو خوشیاں راس نہ آئیں..... دادی کے بعد ماں اور باپ نے یکے بعد دیگرے دو گز زمین سمیٹ لی۔ قدرت اُن کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی رہی..... اُس کی شادی کے بعد گھر میں یہ سب سے بڑا حادثہ تھا اُس کی بڑی بیٹی کی آمد ہوئی تو دینو نے بڑے پیار سے اُس کا نام "پھولاں" رکھا لیکن حیرت انگیز اب

کے لئے ڈال دیتا۔ اس کے ٹھارے کے پچھواڑے دور تک "ریں" اور "چیڑ" کا جنگل پھیلا ہوا تھا..... صبح جب وہ شہر جاتا تو دودھ کا ایک گڑوا اور لکڑیوں کا ایک گٹھا ساتھ لے جاتا۔ وہی لکڑیاں اور دودھ فروخت کرکے وہ گھر کے لئے سودا سلف لاتا..... ان پہاڑی لوگوں کا دارومدار انہی جنگلات پر منحصر ہوتا۔ بارشوں میں جب جنگلوں کی لکڑ سیلاب کے ساتھ بہہ جاتی تو یہ لوگ دریا سے لکڑ پکڑ کر اکٹھی کر لیتے۔ اس لکڑی کے عوض انھیں کئی جانیں بھی گنوانی پڑتیں..... "دینو" شہر سے جلدی لوٹ کر "ریشما" کے ساتھ مل کر "بانڈی" کی صفائی کرتا وہ گوبر وغیرہ سمیٹ کر باہر ڈھیر کر دیتا اور "ریشما" گوبر کی تھاپیاں بنا کر دیواروں سے جمیڑ دیتی..... یہی تھاپیاں سردیوں میں انھیں جلانے کے کام آتیں..... پھر "دینو" مویشیوں کو چارہ وغیرہ ڈال دیتا اور مرغیوں کو "مرڑو" میں بند کرکے "بانڈی" کا دروازہ بند کر دیتا..... "پھولاں" آس پاس کے کھیتوں سے مکّی کے "ٹانڈے" اکٹھے کرکے گھر لے آتی..... پانی کے چند قطرے "نوری" پر پڑے تو وہ حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی..... اپنی بہن "پھولاں" کو یاد کرکے چھت کا سارا پانی "نوری" کی آنکھوں سے بہنے لگا۔ اُس نے اپنی قمیض کے دامن سے آنسو پونچھ لئے..... چھت سے ٹپکتا پانی اب شدّت اختیار کر چکا تھا..... "نوری" آہستہ آہستہ اٹھی "گھاٹ" کے نیچے سے گھاس کی "پولیں" نکالیں اور اپنے پیروں میں پہن لیں..... "پولیں" کچھ بڑی تھیں۔ چونکہ یہ "پولیں" "دینو" نے اپنے پیروں کا ناپ لے کر بنائی تھیں..... ایک پرانی بوری "نوری" نے سر پر رکھ لی اور ٹھارے کے پیچھے سے ساتھ والے درخت سے ہو کر چھت پر چڑھ گئی۔ اپنا سارا وزن چھت کی مٹی پر ڈال کر دبانے لگی..... "ریشما" ٹھارے کے اندر برابر کھانس رہی تھی..... "نوری"

لگتی تو اس کی بہن پھولاں جو اُس سے پانچ سال بڑی تھی' دینو کی عدم موجودگی میں پاؤں میں گھاس کی "پولیں" پہن کر چھت پر چڑھتی اور چھت کی ساری مٹی اپنے پیروں سے دباتی..... تب تک دباتی رہتی جب تک چھت ٹپکنی بند نہ ہو جاتی..... جب وہ چھت سے اترتی تو اس کے سر پر رکھی ہوئی بوری پوری طرح بھیگ چکی ہوتی..... پھولاں سردی سے ٹھٹھرنے لگتی..... ریشما اُسے مٹی کی بنائی ہوئی کانگڑی میں چند انگار ڈال کر دیتی تو پھولاں اپنا جسم سینکتی اور گیلے کپڑے سکھاتی..... جب بارش تھم جاتی تو پھولاں دو چار مٹی کے چھوٹے چھوٹے برتن بغل میں دبائے چشمے پر پانی بھرنے چلی جاتی..... ان کے ٹھارے سے تھوڑی ہی دور ایک چشمہ اُبل پڑا تھا۔ اصل میں یہ چشمہ کسی فقیر کی دین تھی..... دینو کے پردادا کے وقت میں ایک فقیر جسے سائیں فخر الدّین کہتے تھے گھومتے گھومتے اس علاقے میں پہنچ گیا۔ شدّت کی گرمی پڑ رہی تھی اُسے پیاس نے سخت تنگ کیا۔ جب اُسے آس پاس کوئی پنگھٹ نظر نہیں آیا تو اس نے ایک جگہ پر لکڑی کا کلّہ گاڑ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمین میں سے پانی اُبل پڑا اُس نے اپنی پیاس بجھائی اور وہاں سے چل دیا اور تب سے یہ چشمہ یونہی اُبل رہا ہے... سائیں فخر الدّین کا مدفن آج بھی سامنے والی پہاڑی پر موجود ہے... آس پاس کے سبھی لوگ یہیں سے پانی بھرتے... اس چشمے کا پانی گرمیوں میں یخ ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم ہوتا ہے۔ پھولاں چند لڑکیوں کے ہمراہ سر پر ایک کے اوپر ایک برتن رکھ کر ایک قطار کی شکل میں چل رہی تھی..... چشمے سے تھوڑی دور چلنے کے بعد یہ کچّی سڑک مختلف پگڈنڈیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ جس میں سے ایک پگڈنڈی دینو کے ٹھارے کی طرف جاتی... پھولاں اسی پگڈنڈی پر تنہا چلتی ہوئی گھر پہنچ جاتی۔ دینو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا اور آنگن میں سکھانے

رفتہ رفتہ خارج ہونے لگا...... "نوری" روٹی تیار ہوگئی ؟" دینو" نے کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا... ہاں بابا.... بابا آج آپ نے اتنی دیر کیوں کردی شہر میں...؟ آپ نے دیکھا نہیں آسمان ابر آلود تھا...؟ بیٹی وہ نمبردار صاحب کا کام تھا شہر میں.... بس وہی نبھاتے ہوئے دیر ہوگئی..... کس نمبردار کا کام ؟ نوری نے توا چولہے سے اتارتے ہوئے پوچھا... اس گاؤں کے نمبردار کا..... "دینو" ریشما کے بستر میں پاؤں چھپاتے ہوئے بولا۔ بابا ! آپ نمبردار کا کام کیوں کرتے ہیں ؟ آپ کوئی ان کے نوکر ہیں ؟ "نوری" نے معصوم سوال کیا.... "نوری" بیٹی یہ بات نہیں ہے... دراصل وہ اس گاؤں کے مالک ہیں... ضرورت کے وقت قرض دیتے ہیں.. فصل کے وقت بیج دیتے ہیں اور وقت پر کھاد دیتے ہیں..." قیمت نہیں لیتے کیا ؟.....

" نوری کے سوال پر وہ جھینپ گیا اور اس نے چپ سادھ لی... اس کی خاموشی دیکھ کر نوری نے کہا "اچھا تو آپ اُس سے ڈرتے ہیں ؟" "بیٹی یونہی سمجھ لو..." "بابا ! لیکن کیوں ؟" "بیٹی تو ابھی نادان ہے۔ ان باتوں کو نہیں سمجھوگی... ہم لوگوں کی زندگی نمبرداروں اور سرپنچوں کے لئے کھلونے سے زیادہ قیمتی نہیں ہم وہ کٹھ پتلیاں ہیں جن کی ڈور ان کے ہاتھوں میں ہے...." دینو" نے "لوئی" سے اپنا جسم ڈھانپتے ہوئے کہا... کیوں بابا ؟ نمبردار کوئی خدا ہے وہ بھی تو آپ کی طرح انسان ہے... ارے بیٹی وہ بڑے لوگ ہیں... آپ جھوٹ بولتے ہیں بابا... آپ ہی اُن سے بڑے ہیں... وہ کیسے بیٹی ؟ دیکھئے نا آپ کا قد ان سے اونچا ہے۔ آپ کی داڑھی اُن سے لمبی ہے۔ بیٹی ان کی پہنچ بڑی دور تک ہے... آپ کی پہنچ بھی تو دور تک ہے جبھی تو آپ نماز کے بعد زور زور سے اللہ میاں سے دُعا مانگتے ہیں۔ آپ ہی تو اس دن کہہ رہے تھے کہ آپ کی آواز اللہ میاں کے پاس پہنچ جاتی ہے... وہ سب

سوچنے لگی آج کون اُسے آواز دے گا کہ پانی ٹپکنا بند ہو گیا ہے یا نہیں...
آج اگر "پھولاں" ہوتی یہ سوچ کر پھر ایک بار اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں
کا سیلاب آ گیا.... پھر "نوری" نیچے اتر گئی۔ اُس نے دیکھا چھت ٹپکنی
بند ہو گئی ہے۔ "نوری" نے اطمینان کا سانس لیا اُس نے "پولیں" اتار کر
کھاٹ کے نیچے رکھ دیں اور خود چولہے کے پاس بیٹھ گئی۔ اُس کا جسم ٹھنڈا ہو چکا
وہ آگ سینکنے لگی..... اندھیرا آہستہ آہستہ پھیلنے لگا تھا لیکن "دینو" ابھی
تک شہر سے نہیں لوٹا تھا۔ "نوری" کو یہ فکر تھی کہ کہیں "بیتاڑ نالے" کا پانی نہ
بڑھ جائے۔ "نوری" نے اپنے ہاتھ سینکے اور اٹھ کر مٹی کے "کٹھار" سے مکّی کا
آٹا ایک سلور کی بڑی پرات میں نکال کر پاس کے برتن سے پانی کا گلاس لے کر
آٹا گوندنا شروع کیا.... چولہے کے ایک طرف ہانڈی میں سرسوں کا ساگ پک رہا
تھا اور دوسری طرف اُس نے "توا" رکھ دیا..... "نوری" نے پانی کے چھینٹے
سے دیکھا کہ "توا" گرم ہو چکا تھا۔ دوسری طرف ہانڈی میں اس نے چمچہ ہلایا۔
پھر مکّی کے آٹے کی روٹی بنا کر "توے" پر ڈال دی... "دیں" کی لکڑیاں..
چولہے میں جل رہی تھیں۔ آگ بہت تیز تھی۔ جلد ہی "نوری" نے بہت ساری
روٹیاں تیار کر لیں۔ باہر سے کچھ آواز سن کر وہ کھڑکی سے جھانکی۔ اس کا باپ
"دینو" آ رہا تھا۔ "دینو" نے ٹھارے میں قدم رکھا۔ اندر دھواں ہی دھواں تیر
رہا تھا۔ اُس کی بیوی "ریشما" لیٹی لیٹی کھانس رہی تھی۔ وہ بھی ریشما کے پاس
کھاٹ پر بیٹھ گیا اور اپنی جیب سے چند پڑیاں نکال کر "ریشما" کی طرف
بڑھاتے ہوئے کہا۔ یہ لے ایک پڑیا۔ ابھی پانی کے ساتھ کھا لے اور دوسری
صُبح کو کھا لینا..... حکیم صاحب نے کہا ہے کہ ان دنوں لسّی مت پینا..
دھوئیں سے "دینو" کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ زور زور سے کھانسنے لگا
اُس نے بڑھ کر کھڑکی اور دروازے کے کواڑ کھول دئے۔ دھواں ٹھار سے

شِوجی بھگوان مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ "رامو" نے بیل دینے سے صاف
صاف انکار کیا تو سرپنچ نے نرم لہجے میں کہا۔ "رامو" تم تو بڑے عقیدت مند ہو
بڑی شردھا ہے تمہارے دل میں بیل دیوتا کے لئے۔ ... ارے "رامو" میں
تو مذاق کر رہا تھا تم نے سچ مان لیا... اسے یہ مویشی تو ہمارے گھر کی
ہمارے گاؤں کی شان ہیں شان... سرپنچ کی گفتگو سے "رامو" بے حد متأثر
ہوا اور ہاتھ جوڑ کر سرپنچ سے کہنے لگا... مجھے معاف کر دیجئے سرپنچ صاحب
میں اپنے من میں آپ کے لئے نہ جانے کیا کیا سوچنے لگا تھا... ارے یہ کیا کر رہے
ہو۔ یہ کہہ کر سرپنچ صاحب شادی کی دعوت دے کے چلے گئے... سرپنچ کے بیٹے
کی شادی بڑے دھوم دھام سے ہو گئی وقت گزر گیا۔ اپنی بے عزتی کا بدلہ
لینے کے لئے ایک دن سرپنچ نے چرواہے کے ہاتھوں "رامو" کے تمام مویشیوں)
کو نیلا تھوتھا کھلوا دیا۔ شام کو جب رامو اپنے مویشی واپس لانے گیا تو اس کے مویشی
ہری ہری گھاس پر لمبی نیند سو رہے تھے۔ اس کے علاوہ مقبول جو محکمہ جنگلات
میں ایک گارڈ تھا، بڑا ایماندار تھا۔ اس لئے وہ کسی سے ڈرتا نہیں تھا۔ ایک
بار سیلاب کے بعد اس نے نمبردار کے چند چمچوں سے ناجائز لکڑی ضبط کرنی
چاہی تو نمبردار کے آدمیوں نے اسے دریا میں دھکیل دیا۔ اور گاؤں میں یہ
خبر پھیلا دی کہ وہ پیر پھسلنے سے پانی میں بہہ گیا... اس کے چھوٹے چھوٹے
بچے یتیم رہ گئے... ایک ایسا واقعہ جو میرے ذہن پر اشتہار بن کر چپک
گیا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے بدنصیب باپ کی ہے جس نے نمبردار کی مرضی
کے خلاف دوسرے گاؤں میں اپنی بیٹی کی شادی طے کر دی لیکن شادی سے
ایک دن پہلے ہی لڑکی کو گھر سے اٹھوا لیا گیا اور آج تک ایک باپ ہاتھ مل
رہا ہے۔ اس کی بیٹی کہاں ہے کس حال میں ہے کوئی نہیں جانتا... سب
جانتے ہیں وہ کتنے ظالم ہیں لیکن ان کے خلاف کوئی زبان کھولنے کی ہمت
نہیں کرتا... ایک اہم بات یہ کہ اگر کبھی رات کو نمبردار کسی کو بلا لے تو سمجھو وہ

تو ٹھیک ہے میں تجھے کیسے سمجھاؤں۔ ۔ ۔ سارا گاؤں اُن کی عزّت کرتا ہے۔ لوگ دوُر سے ان کو سلام کرتے ہیں۔ ۔ ۔ تو کیا ہوا۔ ۔ ۔ ہٹھو کا ابّا بھی تو کل آپ کو دوُر سے سلام کر رہا تھا۔ ۔ ۔ بیٹی وہ سلام اور ہوتی ہے۔ ۔ ۔ تو کیا سلام ۔ ۔ ۔ سلام میں فرق ہوتا ہے؟ تجھ سے باتوں میں کون جیت سکتا ہے؟ دیپو نے آخری نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔ "نوری" تو نہیں جانتی ان لوگوں کو۔ ۔ ۔ اگر کوئی ان کی بات نہ مانے تو معلوم ہے وہ کیا کرتے ہیں۔ ۔ ۔ مار ڈالتے ہوں گے۔ ۔ ۔ جیسے "نوری" نے پہلے ہی جواب سوچ کر رکھا تھا۔ ۔ ۔ نہیں بیٹی! مار ڈالتے تو اچھا تھا وہ تو زندہ رکھتے ہیں تڑپ تڑپ کر جینے کے لئے۔ ۔ ۔ کیوں بابا۔ ۔ ۔؟ تاکہ انھیں دیکھ کر پھر کوئی گاؤں کا باشندہ ان کی حکم عدولی نہ کر سکے۔ اب دیکھو نا "میرو" کا حشر کیا ہوا۔ ۔ ۔ اُس بیچارے کا یہی قصور تھا کہ اس نے سرپنچ کے آدمی سے فصل کے لئے بیج نہیں لیا تھا۔ کیونکہ وہ "میرو" سے سود سمیت وصول کرتا حالانکہ اس کے پاس اگلی فصل کے لئے بھی بیج موجود تھا۔ موقعہ دیکھتے ہی اُس کی تیار کھڑی فصل میں آگ لگوا دی تاکہ وہ دانے دانے کو محتاج ہو جائے۔ ۔ ۔ اور وہ بیچارہ "رامو" اُس پر سرپنچ نے کتنا ظلم ڈھایا۔ ۔ ۔ سرپنچ نے "رامو" سے کہا کہ آج تک تمہارے مویشی ہماری زمین کی گھاس چرتے رہے اب تو تمہارے پاس مویشی بھی کافی ہو گئے ہیں۔ میرے بیٹے کی شادی پر سفید بیل میرے ہاں بھیج دینا تاکہ ہمارے مہمانوں کو گوشت کی کمی محسوس نہ ہو۔ ۔ ۔ لیکن "رامو" نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ مائی باپ۔ ۔ ۔ سورج، آگ، پانی، گائے اور بیل یہ سب ہمارے دیوی دیوتا ہیں۔ ہم ان کی پوجا کرتے ہیں اسی لئے تو شِو مندر کے باہر پیپل کے پیڑ کے پاس پتھر کا بنا ہوا بیل جس کے گلے میں گھنٹی لٹک رہی ہے سجا کر رکھا ہے۔ اگر میں نے آپ کو بیل دے دیا تو مجھے بہت پاپ لگے گا۔

رہا تھا۔ اب جلدی ہی ریشما ٹھیک ہو جائے گی اور اس ٹھہارے کا چوتھا کونہ پھر سے آباد ہو جائے گا۔ دروازے پر ہونے والی دستک سے اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ "چمنی" کی "لو" میں "دینو" آہستہ آہستہ اٹھا اور دروازہ کھولا۔ سامنے دو آدمی ہاتھ میں مشعل نما "دیئی" جلتی ہوئی لئے کھڑے تھے۔۔۔۔ "دینو" کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔۔۔۔ سنا دی ساری کہانی اپنی بیٹی کو۔۔۔۔۔؟ ایک آدمی نے پوچھا۔۔۔ بچّی ہے نیند نہیں آ رہی تھی اس لئے کہانی سنا دی۔ دینو تھوک نگلتے ہوئے بولا۔۔۔ اچھّا کیا۔۔۔۔ تمہیں نمبردار صاحب نے اسی وقت بلایا ہے۔۔۔ کیا۔۔۔۔؟ ہاں جلدی کرو۔۔۔۔ دینو نے آخری نظر اپنی بیوی ریشما اور نوری جو نیند میں بے سدھ تھیں ڈالی پھر ایک نظر اپنے ٹھہارے کے چوتھے کونے پر ڈالی اور دروازے کے کواڑ بند کر کے اُن آدمیوں کے ساتھ نا معلوم منزل کی طرف چل پڑا۔

اُس کی زندگی کا آخری دن ہے۔ دینو نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے اپنی بات ختم کی..... بابا! اتنی ٹھنڈ میں آپ کے ماتھے پر پسینہ کیوں؟ "نوری" نے "دینو" کی طرف حیرت زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ کچھ نہیں بیٹی یونہی... دراصل اسے کچھ شُبہ ہوگیا تھا کہ باہر کوئی اُس کی گفتگو سن رہا ہے لیکن اُس نے اس بات کو کوئی اہمیّت نہیں دی... بابا! اگر یہ لوگ اتنے ظالم ہیں تو گاؤں والے ان کے خلاف آواز کیوں نہیں اٹھاتے ... ظلم کرنے والے سے ظلم سہنے والا زیادہ پاپی ہوتا ہے... بیٹی وہ تو سچ ہے لیکن... لیکن کیا بابا...؟ آپ ہی سب سے پہلے ان کے مظالم کے خلاف آواز بلند کیوں نہیں کرتے... "دینو" معصوم "نوری" کی باتیں سن کر ہنسا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اس معصوم کو کیا بتائے کیسے بتائے کہ جس باپ نے پہلے ہی ایک بیٹی کھو کر اس تہارے کا چوتھا کونہ ویران کردیا ہے وہ اب ایک اور کونہ اجڑا ہوا نہیں دیکھ سکتا... ایک معمولی سے جرم کی اتنی بڑی سزا ملی ہے کہ یہ سزا جھیلنے کے بعد اب ان بوڑھی ہڈیوں میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ پھر کوئی بھول کر سکے..... بیٹی وہاں پر آواز اٹھانا ہی فضول ہے جہاں بزدل لوگ رہتے ہوں، جہاں آواز دیواروں سے ٹکرا کے واپس لوٹ آئے... تنہا آواز کچل دی جاتی ہے۔ ہزاروں آوازیں کچلنا مشکل ہوتا ہے.... دینو نے دیکھا نوری کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوچکی تھیں۔ اس نے نوری کو چٹائی پر سلا دیا تھوڑی ہی دیر میں نوری نیند کی آغوش میں چلی گئی.... رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی... آسمان پر بادلوں کی حکومت برقرار تھی... ہوا کی سرد لہریں دروازے کے چھیدوں سے تیزی سے اندر داخل ہو رہی تھیں... "دینو" نیم دراز ہو کر چھت کو گھور رہا تھا وہ سوچ

دوست

اس کے نام سے مجھے بے حد لگاؤ تھا۔ کیوں نہ ہوتا . . . . ہر مشکل وقت میں اُس نے میرا ساتھ نبھایا تھا . . . . میٹرک میں پڑھنے کے باوجود فیل ہوا تو اس نے سہارا دیا۔ آگے چل کر نوکری سے مایوسی ہوئی تو اس نے ساتھ دیا باپ کے مرنے پر بھی وہ میرے ساتھ تھا۔ گھر کے خرچہ کا سوال آیا تو وہ پیش پیش تھا۔ اگر یوں کہوں کہ وہ میرا دوست بن چکا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ اس سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی، کہاں ہوئی، مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ یہ وفادار دوستوں کی طرح قدم سے قدم ملا کر چلتا رہا۔ آج جب میرے حالات بدلنے لگے تو اس نے مجھے اشارتاً کہا کہ مجھے بھول مت جانا کیونکہ زندگی کے کسی موڑ پر تمہیں پھر میری ضرورت پڑے گی۔ میں نے آج تک ہر قدم پر تمہارا ساتھ دیا ہے۔ آئندہ بھی ساتھ چلنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ اس نے مجھے احساس دلایا اب اگر تم میرے دشمن سے ناطہ جوڑ لو تو مجھ پر کیا بیتے گی۔ چند دنوں کی خوشی کے لئے تم اپنا ماضی بھول جاؤ یہ اچھا نہیں۔ وہ بولتا ہی جا رہا تھا اور میں نے اس کی باتیں سُن کر ان سُنی کر دیں۔ اس کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیا اور اس کے دُشمن سے دوستی کر لی۔ دن گذرتے گئے۔ میں آہستہ آہستہ اس کا نام تک بھول گیا۔ اچانک ایک رات زور کی آندھی چلی۔ میرے مکان کی چھت اڑ گئی۔ میں تن تنہا بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ مجھے رہ رہ کر اس دوست کی یاد آ رہی تھی۔ اس وقت احساس ہوا کہ ماضی کو بھول کر میں نے بہت غلطی کی۔ صبح کو میرا سامنا پھر اُسی سے ہوا مجھے یوں لگا جیسے میرا اور اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

ووٹ

چودھری صاحب مبارک ہو ....
مبارک ہو...... اس بار پھر آپ اسمبلی کا
الیکشن مشکل جیت گئے۔

ہاں! چند ورام۔ لیکن مبارک اس سرپنچ
کو دو جس کی جعلی ووٹوں سے میں جیت گیا۔

جیب کاٹی ہے۔ حوالدار نے اسے کھینچتے ہوئے کہا۔ لڑکی نے اپنے آپ کو چھڑانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ ناکامیاب رہی۔ آخرکار سپاہیوں نے اسے اٹھالیا اور جیپ میں بھر دیا۔ کوتوالی پہنچ کر حوالدار نے لڑکی سے کہا۔ "اب پڑی رہو حوالات میں۔ آنے دے بڑے صاحب کو، جیب کاٹنے کی ایسی سزا دیں گے تو بھی کیا یاد کرے گی۔ لگتا ہے اس سے پہلے کبھی حوالات کی ہوا نہیں کھائی۔ اور پھر اس لڑکی کی پٹائی شروع کر دی۔ سپاہی حوالدار سب ہی اپنے اپنے ہاتھ چلا رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ بے ہوش ہوگئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک عالیشان خواب گاہ کے عالیشان بیڈ پر پایا۔ تھکاوٹ سے اس کا جسم چور چور تھا اور وہ اپنے کپڑے تلاش کرنے لگی۔

احساس

وہ بیس سال کا تھا جب اس کی ملاقات کسی نے ایک غیر ملکی ایجنٹ سے کرائی۔ تب سے وہ اپنے ملک میں اپنے شہر میں تباہی و بربادی کا کھیل کھیلتا آرہا تھا۔ آئے دن شہر میں فرقہ دارانہ فسادات کراتا۔ کبھی تہوار پر ہندو مسلم فساد کراتا، تو کبھی ہندو سکھ فسادات کراتا۔ کبھی کسی بھیڑ میں بم دھماکہ تو کبھی کسی کلب میں بے گناہوں کا خون بہاتا۔ اسے اس کے عوض لاکھوں روپے ملتے۔ کسی ماں کا جوان بیٹا چل بستا یا کسی کی مانگ کا سندور مٹ جاتا یا کسی بہن سے اس کا بھائی چھن جاتا تو اسے کوئی غم نہیں ہوتا۔ اس کے آگے انسانی خون کی، انسانی جانوں کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ کسی کے مرنے کا اسے ذرا بھر احساس نہیں ہوتا۔ آج بھر وہ بہت خوش تھا جب اس نے ایک

وہ رشتہ ہے جو اٹوٹ ہے۔ واقعی وہ میرا سچّا دوست ثابت ہوا۔ آج پھر ایک بار اس نے مصیبت میں میرا ساتھ دیا۔ اب مجھے وہ اور بھی پیارا ہو گیا تھا۔ آپ پوچھیں گے کون ہے وہ۔ ارے صاحب! وہی جسے میں اپنا دوست کہتا ہوں اور کہتے ہیں غم۔

سزا

کوتوالی کا حوالدار روزنامچے کی ورق گردانی میں مصروف تھا کہ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی.... ہیلو.... ہیلو.... ہاں ہاں میں کوتوالی کا منشی بول رہا ہوں.... کیا.... ؟ گرین پارک میں.... اچھا اچھا میں ابھی پہنچتا ہوں۔ حوالدار نے ریسیور نیچے رکھتے ہوئے کہا۔ پھر حوالدار چند سپاہیوں کے ہمراہ جیپ میں سوار ہو گیا اور جیپ چل پڑی۔ ایک سپاہی نے پوچھا "ہم کہاں جا رہے ہیں۔" "ایک لڑکی گرین پارک میں آوارہ گردی کر رہی ہے اسے گرفتار کرنے" حوالدار نے سگریٹ کا دھواں ہوا میں چھوڑتے ہوئے کہا.... جیپ سنسان سڑک پر برق رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد جیپ گرین پارک کے باہر آ کر رک گئی۔

حوالدار اپنے سپاہیوں کے ساتھ پارک میں داخل ہو گیا۔ اُس کی نظریں ہرے لباس والی لڑکی کو تلاش کر رہی تھیں۔ خبر کے مطابق اس لڑکی کے بال سنہرے تھے۔ حوالدار ہر پھولوں کی جھاڑی کے پیچھے اسے دیکھ چکا تھا۔ وہ لڑکی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی اچانک.... شور سن کر حوالدار پیچھے مڑا اور اس بھاگتی ہوئی لڑکی کی طرف لپکا۔ "چل حرام زادی، آوارہ گرد

پانچ کا نوٹ

کالج کے پچھواڑے کی چڑھائی چڑھنے کے بعد راشن اسٹور کے دائیں طرف ایک ضعیف العمر اندھا ہاتھ میں سلور کا ٹوٹا ہوا کشکول لئے چل رہا تھا اللہ کے نام پر اس اندھے کو کچھ دے دو۔ آنکھوں والو، آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔ بھگوان کے نام پر اس اندھے کی مدد کرو۔ اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ یہ اندھا دُعائیں دے گا۔ کسی کے قدموں کی چاپ سن کر وہ زور زور سے چلّانے لگتا اور کبھی لاٹھی سے کشکول بجا کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا۔ چلّاتے چلاتے اس کا گلا خشک ہو گیا تھا مگر ابھی تک اس کے کشکول میں کسی نے ایک سکّہ بھی نہیں ڈالا تھا۔ سڑک کی دوسری جانب امام بارگاہ کی سیڑھیوں پر ایک تیس سالہ بھکارن جس کی میلی قمیص جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی بائیں طرف کی چھاتی ایک بڑے سوراخ سے راہگیروں کی طرف جھانک رہی تھی۔ دائیں گھٹنے اور رانوں پر شلوار بھی پھٹی ہوئی تھی جس سے اس کا گورا بدن صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مشکل سے وہ بھکارن نہیں لگ رہی تھی البتہ وقت کے بے رحم تھپیڑوں نے اسے بے درد زمانے کے آگے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے آدھا دوپٹہ سیڑھیوں پر بچھا رکھا تھا۔ آنے جانے والے سب لوگ اس کی بچھائی ہوئی چادر پر کم توجہ دیتے مگر اس چھلکتے ہوئے شباب پر اپنی گندی نظریں جما لیتے۔ وہ لوگوں کی ہوس بھری نگاہوں کی تاب نہ لا کر نظریں جھکا لیتی۔ اچانک اس کے کانوں میں ٹھن کی آواز آئی اُس نے

ویڈیو ہال میں نئی پکچر کے ریلیز ہونے پر بھاری رَش دیکھ کر وہاں ٹائم بم رکھ دیا تھا۔ وہ کافی دور کھڑا بڑے اطمینان سے سگریٹ کے مرغولے ہوا میں چھوڑ رہا تھا۔ اس کے کان بم دھماکے کی آواز سننے کے لئے بے چین تھے۔ دھماکے کی آواز سن کر وہ اور بھی خوش ہوا۔ دوسرے دن جب اس نے حسب معمول اخبار کا مطالعہ کیا تو . . . . ایک نام پر آکر اس کی نظریں جم گئیں۔

اخبار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ ہاتھ پاؤں بری طرح کانپنے لگے۔ ذرا سی دیر میں پسینے سے شرابور ہو گیا۔ آج اس کو انسانی خون کی قیمت معلوم ہو گئی تھی۔ اسے کسی کے مرنے کا پہلی بار احساس ہوا تھا یہ احساس اس لئے ہوا تھا کیونکہ جس ویڈیو ہال میں اس نے ٹائم بم رکھا تھا اس کے مرنے والوں میں اس کا سگا بھائی بھی شامل تھا۔

بچّے کے منہ میں دودھ ٹپکتے ہی چپ ہوگیا۔ وہ آرام سے چھاتی چوسنے لگا۔ بھکارن کا برہنہ بدن دیکھ کر لڑکے کے دل میں شیطان جاگ اٹھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنے ناپاک قدم بھکارن کی طرف بڑھائے اور پیچھے سے بھکارن کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔ بھکارن نے گردن گھما کر دیکھا تو وہی لڑکا تھا۔ وہ ڈر گئی۔ اس نے چلّانے کی کوشش کی مگر کچھ سوچ کر وہ چپ ہوگئی۔ اس نے اپنا جسم اس درندے کے قبضے سے آزاد کرانے کی بے حد کوشش کی۔ اس زور زبردستی میں اس کے ہاتھوں سے بچّہ چھوٹ کر در و دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا۔ بچّے نے ایک زوردار چیخ ماری۔ وہ اس درندے کے قبضے سے آزاد ہوگئی۔ وہ بچّے کی طرف بڑھی تو لڑکے نے اسے تنگڑی مار کر گرا دیا۔ اور خود اس پر جھپٹ پڑا۔ بھکارن نے اس کے عضوِ تناسل پر زوردار لات رسید کر دی۔ لڑکا کراہ کر رہ گیا۔ اس نے بڑھ کر بچّے کو اٹھالیا اور سینے سے لگالیا۔ بچّہ ایک دم چپ ہوگیا جیسے کبھی رویا ہی نہیں تھا۔ وہ لڑکے کی طرف کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ مجھ میں تمہیں اپنی ماں بہن نظر نہیں آئی۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔ ایک زوردار تھپڑ لڑکے کے منہ پر دے مارا۔ لڑکے کا منہ غصّے سے سرخ ہوگیا۔ وہ اپنا گال سہلاتا ہوا بولا۔ ”وہاں تو بڑا مسکرا رہی تھی۔ پانچ کا نوٹ دیا ہے مفت میں ہاتھ نہیں لگایا اور چاہیے تو لے لے۔ پانچ روپے سے تم میری عزّت خریدنا چاہتے تھو۔ میں اپنی بے بسی بیچ رہی ہوں، عزّت نہیں․․․ تم جیسے بھیڑیئے ہی سماج میں عورت کو عزّت کی روٹی کھانے نہیں دیتے۔ بھکارن نے پلو کی گانٹھ کھولی اور پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اس کے منہ پر دے مارا۔ ”لے اپنے پانچ روپے۔ یہی پانچ روپے دیکر اپنی ماں بہن کو ہاتھ لگانا۔ میں بھکارن ہوں کوئی ویشیا نہیں“ لڑکے نے واپس اٹھانے کی کوشش کی مگر اس سے قبل بھکارن نے ایک اور تھوک اس کے منہ پر دے ماری۔ بھکارن کا گلا خشک ہوگیا۔ لڑکا منہ لٹکا کر دروازے

نظریں اٹھاکر دیکھا کسی نے اس کی بچھی ہوئی چادر پر ایک روپے کا سکہ پھینکا تھا وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس سڑک سے زیادہ تر کالج کے لڑکے ہی گزر رہے تھے۔ دوسری طرف وہ اندھا برابر چلاّ رہا تھا۔ لیکن اس کے پاس وہ جسم نہیں تھا... وہ شباب نہیں تھا جس سے متوجہ ہو کر لوگ اپنی جیب ہلکی کرتے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ اس کے سامنے ایک بھکارن بیٹھی ہے وہ سوچتا کاش وہ عورت ہوتی تو اس کے آگے بھی روپیوں کے ڈھیر لگے ہوتے۔ دیکھتے دیکھتے بھکارن کی چادر سکوّں سے بھر گئی۔ وہ چادر سمیٹنے ہی والی تھی کہ ایک نوجوان لڑکے نے اس کے جسم کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد اس کی چادر پر پانچ کا نیلا نوٹ ڈال دیا اور بھکارن کو آنکھ سے اشارہ کرنے کے بعد مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ پانچ کا نوٹ دیکھ کر بھکارن بھی مسکرائی تھی۔ وہ اٹھ کر اپنی رہائش گاہ کی طرف چل پڑی۔ تھوڑی دور جا کر اُس نے مڑ کر دیکھا وہ حیران رہ گئی۔ وہ لڑکا جس نے اس کی چادر پر پانچ کا نوٹ ڈالا تھا اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ اس نے سوچا اتفاقیہ ہوگا۔ وہ تیز تیز چل رہی تھی۔ اب اس نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔ وہ لڑکا کسی آوارہ کتّے کی طرح اس کے پیچھے دُم ہلا رہا تھا۔ وہ بھکارن ایک ٹوٹی پھوٹی بانڈی میں گھس گئی۔ لڑکا بھی تیز تیز چل رہا تھا۔ اس کی سانس پھول گئی تھی۔ اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا اور آہستہ سے بانڈی کے اندر قدم رکھا۔ اندر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

سلور کے چند کالے سیاہ برتن بکھرے پڑے تھے۔ وہ چپ چاپ دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ ایک پھٹی پرانی چٹائی پر ایک چھوٹا سا بچہّ بھوک سے بلک رہا تھا۔ بھکارن نے اسے سینے سے لگا کر اس کا ماتھا چوما۔ اس کی آنکھوں سے ممتا جھلک رہی تھی۔ بھکارن نے قمیض اوپر اٹھا کر دونوں چھاتیاں باہر نکالیں

سمیت بہہ گئے ۔ گورنمنٹ نے امداد کا اعلان کیا تھا ۔ اسی کی ریلیف مثل بڑی مشکل سے پٹواری سے مکمل کرواکے تحصیل تک پہنچائی تھی ۔ اب اس کے لئے روز چکر لگانے پڑرہے ہیں۔" دینو نے آخری سیڑھی پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا ۔

"لیکن بابا ! سیلاب تو ستمبر کے مہینے میں آیا تھا اور آج مارچ ہے ۔ باقی لوگوں کو تو ریلیف بھی مل گئی ۔"

" ہاں ! بیٹا جنھوں نے کچھ دیا ان کی مثل کلکٹر صاحب کے دفتر میں پہنچ گئی ۔ ہم غریبوں کو پوچھنے والا کون ہے ۔ لیڈر لوگ بھی پانچ سال میں ایک بار آتے ہیں ۔ اور ہمیں بیوقوف بنا کر چلے جاتے ہیں ۔ بڑی مشکل سے فائیل نکلوائی ۔ اس پر اعتراض لگا ہے ۔ کہ چوکیدار کی رپورٹ نہیں ہے ۔ آج ہی صبح ڈلو گام سے چوکیدار کی رپورٹ کراکے بابو کو دی ہے ۔ اب خدا جانے کب ریلیف ملے گی اور میں اپنا ڈھارا تعمیر کروں گا ۔ اس وقت میرے بال بچے کسی پڑوسی کے ڈھارے میں رہ رہے ہیں ۔"

" بابا تم اپنے کسی بیٹے کو تحصیل میں کیوں نہیں بھیجتے ۔ آپ کو اتنی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے ۔"

دینو تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگیا ۔ پھر روہانسی آواز میں بولا :

"کیا بتاؤں ایک بیٹا تھا مقبول' وہ بھی دو سال پہلے سیلاب میں لکڑیاں پکڑتے ہوئے منڈی کے دریا میں بہہ گیا اور آج تک اس کی لاش تک نہ ملی "۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے ۔ "اب چار لڑکیاں ہیں ۔ دو کی شادی ہوگئی تھی لیکن ایک طلاق لے کر گھر پر بیٹھی ہے ۔ دوسری آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد پڑھائی چھوڑ گئی ۔ ایک ساتویں جماعت میں پڑھتی ہے ۔ بابو نے جب میری روداد سنی تو بیچارہ رونے لگا اور مجھ پر ترس کھا کر کہنے لگا ۔ بابا ! میں کوشش کروں گا کہ آپ کی مثل آج ہی بڑے صاحب تک

سے باہر نکل گیا۔ بھکارن نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے قمیض کے نیچے سے چھاتی نکال کر بچے کے منہ میں دینی چاہی مگر بچہ بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ بھکارن کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ وہ زور زور سے چلانے لگی۔ کہاں ہے پانچ کا نوٹ۔ کہاں ہے پانچ کا نوٹ۔

ریلیف

"دینو" چالیس سال کا ضعیف العمر شخص تھا۔ وہ ضلع پونچھ کے علاقہ منڈی کے دیہات "ڈلو" گام کا باشندہ تھا.... درمیانہ قد سڈول جسم سفید داڑھی جھریوں دار چہرہ، سر پر سفید دستار، جسم پر سفید رنگ کی شلوار، قمیض میل سے لت پت، ہاتھ میں لاٹھی لئے وہ قلعے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ ایک اور جوان تیزی سے اترتے ہوئے دینو سے ٹکرایا۔ دینو دیوار سے ٹکرا کر سیڑھیوں پر گر پڑا۔ پاس سے گذرتے ہوئے ایک اور اجنبی آدمی نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا اور لاٹھی ہاتھ میں پکڑا دی۔

"بابا! آپ اس عمر میں اتنی سیڑھیاں کیوں چڑھتے ہو؟ کیا مقدمے کی تاریخ تھی؟" اجنبی نے اس کے کپڑوں کی دھول جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"اُف! کیا بتاؤں بیٹا۔" دینو نے ایک سرد آہ بھری۔ "مقدمے وقدمے کے چکر میں تو میں کبھی نہیں پڑتا۔"

"پھر کونسی مجبوری کے تحت آپ یہ سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں؟"

"کیا بتاؤں بیٹا۔ گذشتہ سال کے سیلاب میں میرا 'ڈھارا' مال مویشی

پہاڑوں کی برف پگھلنے لگی تھی۔ دریا کا بہاؤ کافی تیز تھا۔ اس کا شور دور دور تک سنائی دے رہا تھا۔ ڈنو گام میں دریا کے قریب ہی دینو کا پہلا ڈھارا تھا۔ دینو کچے راستے پر چلتا ہوا اپنی موجودہ رہائش گاہ پر پہنچا۔

اس کی بڑی بیٹی زونی نے بڑھ کر دینو سے سامان کا تھیلہ لے لیا۔ دینو نے عصا ایک کونے میں کھڑا کیا۔ دستار سر سے اتار کر کھونٹی پر لٹکا دی اور خود تھوڑی پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ہلکا ہلکا دھواں اندر تیر رہا تھا۔ دینو کی بیوی "مالی" اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور لڑکی کو آواز لگائی۔

"گلاں بابا کے لئے چائے لے آؤ۔ پتہ نہیں۔ دینو شہر میں کچھ کھایا بھی ہوگا کہ نہیں"۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا: "آج بھی کام ہوا کہ نہیں۔"

دینو جو کافی دیر سے چھت کو گھور رہا تھا، مالی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا

"کام کوئی نوالہ تو نہیں ہے کہ اٹھایا اور منہ میں ڈال دیا۔ آج ہی چوکیدار کی رپورٹ لکھوا کر دے آیا ہوں۔ پتہ نہیں اور کتنے دن لگیں گے۔"

"تو کیا ابھی اور دن لگیں گے؟" مالی نے کانگڑی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"مالی یہ دفتر کے کام ہیں۔ دن تو لگتے ہی ہیں۔"

"تم بھی سادے کے سادے رہے۔ ایم ایل اے سے سفارش کرائی ہوتی۔"

"چپ رہ! میرا منہ مت کھلوا۔ یہاں ساری بھیڑیں کالی ہیں۔ اس کے گھر گیا تھا اس کے نوکر نے گیٹ ہی نہیں کھولا۔ کہنے لگا صاحب باہر گئے ہیں وہاں سے واپسی پر مجھے پتہ چلا کہ وہ ڈاک بنگلے میں میٹنگ میں ہے۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور عرض کی حضور میرے ریلیف کی مثل تحصیل میں پہنچ گئی ہے۔ جناب اگر فون کر دیں تو میرا کام جلدی ہو جائے گا۔ بڑی مہربانی ہوگی۔" کہنے لگا

"ارے دینو! آج کل گورنر راج ہے۔ ہماری کون سنتا ہے اور کوئی کام ہو تو بتاؤ۔ مجھے میٹنگ میں شامل ہونا ہے۔"

پہنچادوں گا"

"اگر آپ کل نہ آسکیں تو کسی پڑھی لکھی لڑکی کو بھیج دینا۔"

میں نے کہا: "میری ایک لڑکی آٹھویں پاس ہے اس کو بھیج دوں"

تو اس نے کہا: "شاید عورت ذات دیکھ کر صاحب جلدی کام کر دیں گے"

"بابو بابو، کوئی بڑا ہی نیک آدمی لگتا ہے۔ لگتا ہے ضرور کل آپ کا کام ہو جائے گا۔"

"ہاں! بیٹا، اب مجھ میں اتنی ہمت کہاں جو روز سیڑھیاں چڑھوں۔ کل لڑکی کو ہی بھیجوں گا۔ شاید بڑے صاحب کو کچھ ترس آجائے۔"

"بابا! آپ کہاں جاؤ گے؟"

"بیٹا! مجھے بس اڈے تک منڈی کی گاڑی پر چڑھا دو۔ تمہارا بھلا ہوگا۔"

وہ دونوں چلتے بس اڈے تک پہنچ گئے۔ اجنبی نے دیتو کو منڈی کی گاڑی پر چڑھایا اور خدا حافظ کہہ کر چلا آیا۔

گاڑی منڈی کے بس اڈے پر رکی۔ دیتو سب سے آخر میں بس سے اترا کیچڑ سے اس کے فوم کے جوتے بھر گئے۔ وہ سامنے کی دکان پر بیٹھ گیا۔ اور جیب سے ایک گول ڈبی نکالی جس کے باہر شیشہ لگا ہوا تھا۔ پہلے اس نے اپنا چہرہ دیکھا پھر ڈبی کھول کر نسوار کی چونڈی منہ میں ڈالی۔ اب وہ ڈتوگام جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے اپنے نزدیک کا پتھر نسوار کی تھوکوں سے بھر دیا۔ اتنے میں کنڈیکٹر نے ڈتوگام کی آواز لگائی تو دیتو اٹھ کر گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اور گاڑی چل پڑی۔

پھاگن کا مہینہ آدھا گذر چکا تھا۔ درختوں کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ درختوں پر پھول نکل آئے تھے۔ بلبلیں بہار کی آمد پر جھوم جھوم کر آزادی کے ترانے گا رہی تھیں۔ دریا کے پانی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ شاید

دو برابر ٹکڑے کئے۔ اور ایک حصّہ دینو کی پیالی پر رکھ دیا۔ دونوں چائے پینے میں مصروف ہوگئے۔ مالی نے چائے کی لمبی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

"آج نمکین چائے کا آخری ڈنگ تھا ختم ہوگئی۔"

"لے آیا ہوں شہر سے اور کچھ رہ گیا ہو تو کل گلاں سے منگوالینا"۔ دینو نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا اور پیالی نیچے رکھ دی۔ گلایو نے آکر پیالیاں اور سماوار سمیٹ لیا۔

باہر ہلکا ہلکا اندھیرا کائنات پر چھا رہا تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں ابر کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ستاروں کا آنچل اوڑھ لیا اور ماتھے پر چاند کی بندیا سجالی۔ تمام چرند پرند اپنے اپنے گھونسلوں میں جا چھپے تھے۔ کبھی کبھار کتّوں کے بھونکنے کی آواز تاریکی کا سینہ چیر کر دور دور تک نکل جاتی۔

دینو اپنے بستر پر نیم دراز ہو کر کچھ سوچ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ نیند کی دیوی اس پر غالب آنے لگی۔ جلدی ہی وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ چاروں طرف ایک سکوت چھایا ہوا تھا۔ دریا کی آواز کے بغیر کچھ بھی سنائی نہیں دیتا تھا کبھی کبھی کوئی الّو اس خاموشی کو توڑنے میں کامیاب ہو جاتا۔ چاند نے مغرب کی طرف اپنا سفر جاری رکھا تھا۔ تاروں کی چمک رفتہ رفتہ ماند پڑنے لگی تھی۔ زمین اپنے محور پر گھوم چکی۔ چاند اپنا سفر پورا کر چکا تھا۔ ستارے اپنا منہ چھپا چکے تھے۔

پو پھوٹ پڑی۔ چاروں طرف چڑیاں چہچہانے لگیں۔ ساری کائنات نور میں نہانے لگی۔ آفتاب نے مشرق کے پہاڑوں کے پیچھے سے سر اٹھانا شروع کیا۔ دریا کا شور کچھ کچھ کم ہو گیا تھا۔ لوگ دوڑ بھاگ میں لگ گئے۔ دینو نے گلاں کو شہر کی گاڑی پر چڑھایا۔

گلاں ٹھنڈے علاقے کی رہنے والی تھی۔ اس لئے وہ بے حد خوبصورت

"بس میں اپنا سا منہ لے کر واپس چلا آیا۔ الیکشن میں تو کہتا تھا جب کبھی کوئی کام ہو گا مجھے کان سے پکڑ کر لے جانا۔ اب کی بار پھر آیا تو پوچھوں گی۔"

"اچھا کلرک کو ہی کچھ روپے دے دیتے۔"

"مالی بابو بڑا نیک آدمی ہے۔ اس نے خود ہی مجھ سے کہا کہ میں جلد ہی تمہاری مثل صاحب تک پہنچا دوں گا۔ رب اس کا بھلا کرے۔"

"کیا تم کل پھر جاؤ گے؟ پہلے اتنے کمزور ہو گئے ہو۔"

"میں نے بابو کو کہہ کے رکھا ہے کہ کل میں نہیں آؤں گا۔ بلکہ اپنی لڑکی کو بھیجوں گا۔"

"کیا؟ لڑکی کو . . ." مالی نے حیرانگی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

"اور ہے ہی کون؟"

"تو شہر جائے گی جو آج تک کبھی شہر گئی ہی نہیں۔ گلاں تو پھر میرے ساتھ دو چار بار شہر گئی ہے۔ اسے تحصیل کا دفتر معلوم بھی ہے۔ پھر وہ پڑھی لکھی بھی ہے۔"

"بڑھاپے میں تمہاری مت ماری گئی ہے۔ جوان لڑکی کو شہر اکیلے بھیجو گے زمانہ بہت خراب ہے۔" مالی نے لوئی دینو پر سرکاتے ہوئے کہا۔

"مالی! تو خواہ مخواہ گھبرا رہی ہے۔ اس بیچارے بابو نے ذمّہ داری اٹھائی ہے کہ کل کام ہو جائے گا۔ پھر اس نے خود مجھ سے کہا تھا کہ اگر خود نہ آسکو تو لڑکی کو بھیج دینا۔ تم کو روز روز تکلیف ہوتی ہے۔ پھر وہ شام کو لوٹ آئے گی۔ اتنے میں گلاں بو چائے کا سماوار لیکر آگئی۔ سماوار کی بھاپ چھت کی طرف اڑ رہی تھی۔ مالی نے سماوار کا ڈھکن اٹھا کر دو چار پھونکیں ماریں۔ سماوار میں نمکین چائے ابل رہی تھی۔ اس نے پیالی میں تھوڑی سی چائے لیکر نمک چکھا۔ پھر چائے کی ایک پیالی دینو کی طرف بڑھائی۔

دینو نے چائے کی پیالی لیکر پیڑھی پر رکھ دی۔ مالی نے مکی کی روٹی کے

"میں نے کل ہی رپورٹ تیار کر دی تھی۔ اب تم صاحب کے پاس پیش ہو جاؤ۔ یہ فائیل لیکر ان کے ساتھ صاحب کے پاس جاؤ۔" بابو نے چپڑاسی سے کہا تو چپڑاسی نے فائیل اٹھائی اور گلاں کے ساتھ صاحب کے پاس چل پڑا۔

صاحب کسی فائیل کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھے۔ قدموں کی چاپ سن کر انہوں نے نظریں اوپر اٹھائیں تو دیکھتے ہی رہ گئے۔

"گامی یہ کون ہے؟"

"حضور یہ دینو کی بیٹی ہے۔"

"کون دینو؟"

"وہی ڈنو گام والا دینو جو کل آیا تھا۔" چپراسی نے نزدیک جا کر کہا۔

"اچھا اچھا۔ وہ دینو، ٹھیک ہے لاؤ ادھر فائل۔"

چپراسی نے فائل میز پر رکھ دی اور خود دروازے پر کھڑا ہو کر اگلے حکم کا انتظار کرنے لگا۔

صاحب نے فائل کے اوراق پلٹنے شروع کئے۔ دوران مطالعہ اس نے کئی بار گلاں کو چور نگاہوں سے دیکھا۔ گلاں چھت کے نقش نگار کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ صاحب نے بیل بجائی تو چپراسی یکدم اندر آ گیا۔

"گامی! یہ فائل کلکٹر صاحب کے دفتر میں لے جاؤ۔ اور دستخط کرا کے ساتھ لے آنا۔"

"جی حضور!" چپراسی نے فائل اٹھائی اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

چپراسی کے جاتے ہی صاحب گلاں سے ہنستے ہوئے مخاطب ہوئے۔

"دیکھو تم باہر بابو کے پاس بیٹھ جاؤ۔ جونہی گامی فائل لیکر آتا ہے تو تمہارا کام ہو جائے گا۔"

"جی! بہت اچھا" یہ کہہ کر گلاں باہر چلی گئی اور قلعے کے اوپر کھڑی ہو کر

تھی۔ نیلے رنگ کی قمیض شلوار میں وہ کوئی آسمان سے اتری ہوئی پری لگ رہی
گول مٹول سفید چہرہ کالی سیاہ بھوئیں سیاہ بال، دودھ جیسے سفید پاؤں، موٹی
موٹی بلوری آنکھیں گاڑی سے اترتی ہوئی شہر کے تمام لڑکوں کی نگاہیں اس پر
جم گئیں۔ کوئی منچلا کہتا، کیا حُسن ہے۔ کوئی کہتا واللہ کیا بات ہے۔ خُدا نے
اپنے ہاتھوں سے تراشا ہے۔ کوئی کہتا، آجا میری رانی۔ گلاں خود حیران تھی کہ
آخر ماجرا کیا ہے۔ چلتے چلتے اچانک اس کی نگاہ دکان کے باہر لگے ہوئے
آئینے پر پڑی۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ اس قدر خوبصورت ہے۔ وہ پری چھ
سال کے بعد شہر آئی تھی۔ تب وہ چھوٹی سی تھی۔ آج وہ کتنی بدل گئی تھی۔ وہ بازار
سے گذر کر سیدھا قلعے کی سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر پہنچ گئی۔ سیڑھیاں
چڑھنے سے اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ اس نے اطمینان کا سانس
لیا پھر وہ سیدھا ایک کمرے میں چلی گئی۔ اتفاق سے یہ بابو کا کمرہ تھا۔ بابو کمرے میں
ایک چپراسی سے محوِ گفتگو تھا۔ گلاں کو دیکھتے ہی وہ اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔ وہ
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گلاں کو دیکھ رہا تھا۔ بابو نے سر سے لیکر پاؤں تک بھرپور جائزہ
لیا۔ اب اسے یقین آیا کہ چوکیدار نے بالکل صحیح کہا تھا کہ اس نے جتنی تعریف
کی تھی گلاں اس سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ آج تک وہ گلاں کو صرف تصوّر
میں دیکھتا رہا تھا لیکن آج وہ اس کے روبرو کھڑی تھی۔

"میں دینو کی لڑکی گلاں ہوں۔"

بابو چونک پڑا۔ "ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ دینو کل کہہ رہا تھا کہ وہ سیڑھیاں
چڑھتے چڑھتے تھک جاتا ہے۔ میں نے کہا تھا کسی اور کو بھیج دینا۔ ارے تم کھڑی
کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔"

گلاں بینچ پر بیٹھ گئی۔ بابو نے کاغذات دیکھنے شروع کئے۔ تھوڑی دیر کے
بعد اس نے فائیل نکال کر میز پر رکھ دی۔ پھر وہ گلاں سے مخاطب ہوا۔

"اب تو منڈی کی آخری گاڑی بھی چھوٹ گئی ہوگی۔ آج رات یہیں رہ لو تو کل چلی جانا۔ کیا تمہارا کوئی رشتہ دار ہے شہر میں؟"

"نہیں تو۔" گلاں کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ کچھ سوچ کر گھبرا گئی۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہمارے گھر میں رہ جاو۔ ہمارے گھر میں بھی عورتیں ہیں۔ اُن کے پاس سو جانا۔" صاحب نے اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہیں نشتر کی طرح گلاں کے نازک بدن پر چبھ رہی تھیں۔ وہ گلاں کی جوانی کے کورے کاغذ پر اپنی ہوس کی گندی روشنائی سے اپنا نام لکھنا چاہتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ کورا کاغذ بہت باریک ہے جس پر نوک دار قلم سے چھید ہونے کا ڈر ہے۔ لیکن پھر بھی اپنے ارادے پر اٹل تھا اور اس میٹھے کنویں کا ایک گھونٹ پانی پینے کا متمنی تھا۔

گلاں تذبذب میں پڑ گئی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ وہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ آخر کار اس نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ عورتوں کے ساتھ سو جائے تو کیا حرج ہے پھر ایک رات کی تو بات ہے۔

"کیا سوچا تم نے؟"

گلاں نے معصومیت سے کہا: "آپ کے گھر میں عورتیں ہیں نا۔"

"لو اور سنو" صاحب نے چپراسی کو ہنستے ہوئے کہا۔ "ارے پگلی! ہر گھر میں عورتیں ہوتی ہیں۔ میں تو تمہیں اس لئے کہہ رہا تھا تاکہ تمہیں کہیں بھٹکنا نہ پڑے سوچ لو۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

گلاں نے سر ہلایا۔ تو صاحب نے کہا:

"گڈ۔ یہ ہوئی نا بات۔" صاحب نے بیل بجائی تو چپراسی اندر آیا

"ان کو ہمارے کوارٹر میں بی بی کے پاس چھوڑ آؤ۔

بازار کی رونق دیکھنے لگی ۔ قلعے کے نیچے پھڑی والے چلّا چلّا کر گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے ۔ ایک طرف کپڑے والے، دوسری طرف راجماش والے، تیسرے طرف سبزی والوں نے سارا بازار سر پہ اٹھا رکھا تھا ۔ کافی دیر تک وہ یہ تماشا دیکھتی رہی صاحب نے بیل بجائی تو بابو اٹھ کر اندر چلا گیا ۔

صاحب نے اسے پاس لا کر سرگوشی میں کچھ کہا ۔ بابو نے ہنستے ہوئے ہاں میں سر ہلا دیا ۔ پھر صاحب بھی ہنس پڑا ۔ اور کچھ پوچھا ۔

" ہاں ! ہاں ! سر ، اچھا سر ۔ ٹھیک ہے " کہہ کر وہ خوشی خوشی باہر نکل گیا ۔

وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا ۔ اس نے چھپ کر دیکھا گلاں بازار کی رونق سے لطف اندوز ہو رہی تھی ۔ بیٹھ کر اطمینان سے اپنا کام کرنے لگا ۔

تھوڑی دیر کے بعد گلاں کو احساس ہوا کہ کہیں منڈی کی آخری بس بھی نہ نکل جائے وہ دوڑ کر بابو کے پاس پہنچی اور کہا :

" بابو جی ۔ مجھے دیر ہو جائے گی ۔ یہ نہ ہو کہ منڈی کی آخری بس چھوٹ جائے ۔"

" دیکھو گلاں ۔ اگر کلکٹر صاحب دفتر میں بیٹھے ہوں گے تو سمجھو کہ تمہارا کام ہو گیا ۔" بابو نے گلاں کو سمجھاتے ہوئے کہا ۔ یہ بات سن کر گلاں چپ ہو گئی اور سوچنے لگی کہ روز روز آنا پڑتا ہے ۔ بابا بھی تنگ آجاتے ہیں ۔ آج یہ کام ہو جائے تو جان چھوٹے ۔

اتنے میں چپراسی کلکٹر صاحب کے دفتر سے فائل پر دستخط کرا کے لے آیا اور صاحب کے ٹیبل پہ رکھ کر باہر چلا گیا ۔

گلاں صاحب کے دفتر میں پہنچی تو صاحب ہنستے ہوئے مخاطب ہوا ۔

" مبارک ہو گلاں ، تمہارا کام ہو گیا ۔"

" سچ ..." گلاں خوشی سے جھوم اٹھی ۔ کہ اتنا بڑا کام اس نے کرایا ۔

" اب چیک لے کر ہی جانا ۔" صاحب نے اپنی کلائی پر نظر دوڑائی اور بولا ۔

اس کی آنکھیں چندھیاں گئیں۔ سارا باتھ روم سفید رنگ کی ٹائیلوں سے جگمگا رہا تھا پیروں کے نیچے رنگ برنگی چپس کا فرش پھیلا ہوا تھا۔ ایک کونے میں گیزر لگا ہوا تھا گلاں اندر پاؤں رکھتے ہوئے گھبرا رہی تھی تاکہ فرش میلا نہ ہو جائے۔ آخر کار وہ اندر داخل ہوئی۔ دروازہ بند کر کے اس نے نہانا شروع کیا۔ نیم گرم پانی سے اس نے اپنا جسم مل مل کے نہایا۔ جونہی وہ باتھ روم سے باہر نکلی۔ اس پر مدہوشی طاری ہو گئی۔

گلاں پلنگ پر اوندھے منہ پڑی ہوئی تھی۔ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے اُسے نشے کی دوائی پلائی ہو۔

صاحب نے نوکرانی سے سرگوشی میں کچھ پوچھا:

"ہاں صاحب! میں نے گیزر میں دوائی ملا دی تھی۔" نوکرانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"گُڈ۔ بہت اچھا اب تم جاؤ۔"

نوکرانی چلی گئی۔ دیوار پر لگی ہوئی گھڑی نے گیارہ کا گھنٹہ بجایا تو گلاں نے اپنے برہنہ بدن پر کچھ رینگتا ہوا محسوس کیا۔ اس نے کروٹ بدلی تو دیکھا صاحب کا کھردرا ہاتھ اس کے برہنہ جسم پر کسی زہریلے ناگ کی طرح رینگ رہا ہے اس نے اٹھنے کی ناکام کوشش کی لیکن نشہ اپنا اثر دکھا چکا تھا۔ پلنگ کے نرم گدّوں پر اسے عجیب سا سکون مل رہا تھا۔ روز پھٹری پر سوتے سوتے اس کی پسلیاں دکھ جاتی تھیں۔ اس نے اپنے اعضاء کو چادر سے ڈھکنے کی ناکام کوشش کی۔ لیکن صاحب نے چادر کھینچ کر دُور پھینک دی۔ اور اس کے برہنہ جسم کو سہلانے لگا۔ وہ جذبات کی بھٹی کو ہوس کی آگ سے گرمانے میں مصروف تھا۔ اس نے گلاں کے نازک ہونٹوں پر اپنی ہوس کی مہر ثبت کر دی۔ گلاں کو لگا جیسے ایک ساتھ کئی زہریلے کانٹے اس کے رخساروں میں چبھ گئے ہوں۔ گلاں نے پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اجگر اپنے شکار کو کنڈلی مار چکا تھا۔ گلاں کسی بے بس پنچھی کی

بی بی کا لفظ سن کر چپراسی کی بھنویں تن گئیں اور وہ گلاں کو ساتھ لیکر چلا گیا۔
چپراسی نے صاحب کی تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دئے۔
" ہمارے صاحب بڑے اچھے ہیں۔ ان کا دل شیشے کی طرح صاف ہے وہ ہمیشہ غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔ اب دیکھو نا تمہارا کچھ ماہ کا کام ایک ہی دن میں کر دیا۔ اگر تمہارا باپ آتا نہ جانے اور کتنی دیر لگتی۔"
پھر دونوں کوارٹر میں داخل ہو گئے۔ کوارٹر میں نوکرانی کے سوا اور کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ گلاں نے سوچا گھر کی باقی عورتیں کہیں باہر گئی ہونگی۔
گلاں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آس پاس کا جائزہ لے رہی تھی۔ دیواروں پر آویزاں بڑے بڑے قیمتی شوپیس اور تصویریں، ڈائیننگ ٹیبل، لال رنگ کے صوفے پلنگ پر بچھائے گئے۔ موٹے موٹے گدّے، رنگین ٹی وی، فرج، کولر وغیرہ دیکھ کر گلاں دنگ رہ گئی۔ کیونکہ گاؤں میں اس نے یہ سب کچھ نہیں دیکھا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھی تو دھنس گئی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اتنے میں صاحب بھی دفتر سے لوٹے۔
" ارے بھئی اس کو کوئی چائے وائے پلائی کہ نہیں۔"
" ابھی لائی حضور۔"
" بیٹھ جاؤ۔ گھر والے باہر گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔"
گلاں آہستہ آہستہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ نوکرانی نے چائے کا ایک کپ گلاں کو تھمایا۔ دوسرا صاحب کو۔ دونوں چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔ صاحب نے اشارے سے نوکرانی کو کچھ سمجھایا۔ تو اس نے ہاں میں سر ہلایا۔ چائے ختم کرتے ہی نوکرانی گلاں سے مخاطب ہوئی۔
" تم کافی تھک گئی ہو۔ جاؤ باتھ روم میں نہا لو"۔ باتھ روم کا نام سن کر گلاں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ تو نوکرانی نے ہاتھ کے اشارے سے باتھ روم کا راستہ دکھایا۔ گلاں باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ کھولا تو اندر نظر پڑتے ہی

ٹیوشن

ڈیڈی میں پاس ہوگیا، میں پاس ہوگیا۔

ممّی، میرا منہ میٹھا کراو۔ میں پاس ہوگیا ہوں۔

شاباش! میرا لال تو پاس ہوگیا۔ لیکن بیٹے گھر میں تو کبھی پڑھتا ہی نہیں تھا۔ پھر پاس کیسے ہوگیا؟

ممّی! وہ ٹیوشن والے ماسٹر جی ہیں نا، انہوں نے پاس کرا دیا۔ لیکن مارک کرنے والوں کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ تمہارا ہی پرچہ ہے۔

ممّی! ہمیں ٹیوشن والے ماسٹر نے کہا تھا کہ تم سب پرچے کالی روشنائی سے لکھنا۔

طرح پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ جب جذبات کی بھٹی پوری طرح گرم ہو گئی تو گلاں نے بے بس ہرنی کی طرح اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔

گلاں کی کراہیں اور سسکیاں کمرے میں گونجتی رہیں۔ آخر کار صاحب نے گلاں کی جوانی کے کورے کاغذ پر اپنی ہوس کی روشنائی کی دوات الٹا دی اور گلاں کی جوانی کا کورا کاغذ داغدار ہو گیا۔ رات بھر وہ موج مستی کرتا رہا۔ آفتاب نے اپنا ڈھیرا ڈال دیا تھا۔ کھڑکیوں کے سوراخوں سے کرنیں چھن کر اندر داخل ہو رہی تھیں۔ گلاں نے ہوش سنبھالا تو اس کا جسم تھکاوٹ سے چور تھا۔ اس کا انگ انگ دُکھ رہا تھا۔ اس کی رانوں میں درد کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی مشکل سے باتھ روم میں پہنچ گئی۔ نہانے کے بعد اس نے تازگی محسوس کی۔

صاحب کی تصویر دیکھ کر وہ دانت پیس کر رہ گئی۔ صاحب کہیں موجود نہیں تھا۔ چپراسی نے آکر اُسے ایک چیک تھما دیا۔ گلاں نے چاہا چیک پھاڑ کر اس کے منہ پر دے مارے لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے دینو کا جھریوں والا چہرہ رقص کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو نکل کر رخسار پر گر پڑے۔ اس نے اپنا آنچل سنبھالا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ قلعے کے نیچے کھڑے ہو کر اس کی بھیگی آنکھیں اس قلعے کا طواف کر رہی تھیں۔ جہاں بیٹھ کر کبھی راجہ انصاف کیا کرتا تھا لیکن آج قلعہ اس کی سادگی پر زور زور سے ہنس رہا تھا۔

خون سے تر تھی۔ اس کے تو مقدر ہی کھل گئے تھے جو کافی دیر بعد انسانی درندے آپس میں ٹکرائے تھے اور پیاسی دھرتی اپنی پیاس بجھا رہی تھی۔ تمام شہر فساد کی زد میں آچکا تھا۔ کئی معصوم کلیاں پھول بننے سے پہلے ہی مسل ڈالی گئیں کئی ماؤں کے جوان بیٹے لقمۂ اجل ہو چکے تھے۔ ہزاروں بچے یتیم، عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ ہر گلی میں انسانی اعضا بکھرے ہوئے تھے۔ شہر کے وسط میں ادھ جلی لاشوں کی بو آرہی تھی۔ سارے شہر پر شیطان کا راج تھا۔ درندگی شباب پر تھی۔ لوٹ مار جاری تھی۔ اس پر شہر کی پولیس انتقام کی آگ میں بے گناہ لوگوں کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا رہی تھی۔ بالآخر فوج نے حالات پر قابو پا لیا۔ پولیس کمشنر نے مولوی اور پنڈت دونوں کو پولیس تھانہ میں طلب کیا۔ تو دونوں اپنے اپنے حامیوں کے ساتھ تھانہ میں داخل ہوئے۔ "کیوں بھئی ؟ آپ نے پُرامن شہر کو جہنم کیوں بنا ڈالا ؟ ...." کمشنر صاحب گرج آواز میں بولے۔ پنڈت جی نے دوہائی دیتے ہوئے بولا: "مہاراج یہ سب قصور مسلمانوں کا ہے۔ انہوں نے گئو ماتا کی ہتھیا کر دی اور اس کا گوشت مندر میں پھینک دیا۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے اپنا دکھڑا سنانا شروع کیا۔ حضور! پہلے ہندوؤں نے شرارت سے سؤر کا گوشت مسجد میں پھینک دیا۔ ابھی ان کے بیان جاری ہی تھے کہ ایک سپاہی اپنے ہمراہ ایک ضعیف شخص کو تھانہ میں لے آیا۔ سلیوٹ دینے کے بعد وہ کمشنر صاحب سے مخاطب ہوا۔ "سر... یہ آدمی ایک رپورٹ درج کروانا چاہتا ہے۔" کمشنر صاحب ہمدردانہ لہجے میں بوڑھے شخص سے مخاطب ہوئے۔ "ہاں بابا بتاؤ کیا بات ہے؟" اس پر بوڑھا شخص آنسو پونچھتے ہوئے بولا: "میں... میں... صاحب میں اس شہر کا باشندہ ہوں۔ بات یہ ہے کہ میرے دونوں بیٹے جائداد کے لئے جھگڑے پر اُتر آئے" اتنا کہنے کے بعد وہ پھر سسکیاں لینے لگا۔ کمشنر صاحب نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا "ہاں ہاں پھر کیا ہوا۔ پھر میرے بڑے لڑکے نے چھوٹے لڑکے کے ٹکڑے ٹکڑے

گوشت کا ٹکڑا

گئو ہتھیا کرنے والوں کو گرفتار کرو ..... گئو ہتھیا کرنے والوں کو سزا دو۔
ایک بڑا جلوس شہر کے بازار سے نعرے بلند کرتا گزر رہا تھا۔ پنڈت جی سب سے آگے تھے جنھوں نے لوگوں کو یہ کہہ کر بھڑکایا تھا کہ مندر کی سیڑھیوں پر سے گوشت کا ایک ٹکڑا ملا ہے۔ بس اسی بات کو لیکر لوگ آگ بگولہ ہو اٹھے۔ ابھی یہ جلوس آدھا بازار ہی پار کر چکا تھا کہ بازار کے دوسرے سرے سے ایک اور جلوس نمودار ہوا
نعرہ تکبیر اللہ اکبر... نعرہ تکبیر اللہ اکبر کے نعروں سے آسمان گونج رہا تھا۔
اس جلوس کی قیادت شہر کے مولانا کر رہے تھے۔ جنھوں نے لوگوں کو یہ کہہ کر اکٹھا کر لیا تھا کہ مذہب خطرے میں ہے کیونکہ انہیں بھی مسجد کے اندر سے گوشت کا ایک ٹکڑا ملا تھا۔ مولوی صاحب کے کہنے کے مطابق کسی نے جان بوجھ کر سؤر کا گوشت مسجد کے اندر ڈال دیا تھا۔ یہ سنتے ہی لوگوں میں مذہب کا جنون جاگ اٹھا اور وہ جلوس کی شکل میں بازار میں نکل آئے۔ دونوں جلوس آمنے سامنے آگئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تصادم ہوگیا۔ چند ہی لمحوں میں غضب ناک آوازیں آنے لگیں۔
... بھاگو ... بھاگو ... مارو ... پکڑو۔ ایکدم پتھراؤ شروع ہوگیا۔ ننھے ننھے پھول جیسے معصوم بچے بھگدڑ میں پیروں تلے کچلے گئے۔ برسوں کی دوستی، محبت، بھائی چارہ گی اور امن و اتحاد کو لوگوں نے پاش پاش کر ڈالا۔
وہ شہر جو کبھی امن و آشتی کا گہوارہ تھا آج آگ میں جل رہا تھا۔ ہر طرف ایک قیامت بپا تھی۔ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے۔ ایکدوسرے پر تیز دھار والے ہتھیاروں سے حملے جاری تھے۔ شہر کی تمام خشک زمین انسانی

وہ تعریف کے پل باندھنے لگتے اور زبردستی شانتی کا ہاتھ پکڑ کر کلائی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے .... "ارے ہماری رانی کی چوڑیاں کہاں گئیں؟" اور کبھی چہرے سے زلفوں کی لٹ بناتے ہوئے کہتے، "کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی، جب دیکھو رسوئی میں گھس رہتی ہو، اپنا بھی خیال رکھا کرو...." تعریفی جملے سنتے ہی شانتی موم کی طرح پگھل گئی۔ اور منہ بناتے ہوئے بولی .... "بڑا خیال ہے نا میرا کب سے کہہ رہی ہوں کوئی نوکر دیکھو۔ ایک آپ ہیں کہ کان پر جوں تک نہیں رینگتی" .... ملہوترہ صاحب کہتے: "شانتی! زمانے کی ہوا بدل گئی ہے۔ اب وہ پہلا وقت نہیں رہا۔ اب تو کسی غیر مرد کو گھر میں رکھتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے جس پر ترس کھا کر کام دو وہی چور یا دہشت گرد نکلتا ہے۔ دیکھا نہیں رائے صاحب کے ساتھ کیا ہوا۔ انھوں نے جو نوکر رکھا ہوا تھا وہ ایک دہشت گرد تنظیم کا ممبر نکلا.... وہ تو خیر ہوئی کہ رائے صاحب کی بیوی نے اسے بازار میں خونخوار شکل کے آدمی سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا اور اس پر نظر رکھی.... پچھلے دنوں مارکیٹ میں جو بم پھٹا تھا اس میں وہ برابر کا شریک تھا.... اب تو مہرہ صاحب نے اسے لمبی سزا دلا دی ہے"۔ آہستہ آہستہ ملہوترہ صاحب نے شانتی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا: "کتنی خراشیں لگی ہیں ہماری رانی کے ہاتھوں میں؛ اب تو نوکر کی تلاش کرنی ہی پڑے گی۔ تمہاری انھی ہاتھوں پر تو میں فدا ہو گیا تھا" اور شانتی کو اپنے قریب کھینچتے تو شانتی اپنی نرم و نازک کلائی چھڑانے کی ناکام کوشش کرتی.... "ہٹو بے شرم کہیں کے.... چھوڑیئے نا۔ وشو آتا ہوگا۔ اس کی چھٹی کا وقت ہو گیا"۔ ملہوترہ صاحب دیر تک شانتی کا ہاتھ سہلاتے رہتے.... وشال کی ایک بڑی اچھی عادت تھی کہ سکول کا کام (ہوم ورک) وہ بغیر کسی کے کہنے کے اپنے کمرے میں بیٹھ کر کرتا ..... وشال کو ملہوترہ صاحب اور شانتی نے اپنے خون سے پالا تھا۔ ایک بار

کرڈالے۔ کچھ کتے اسی گوشت کو لیکر یہاں آئے۔ یہ سنتے ہی پنڈت اور مولوی دونوں ایک دوسرے کو حیرت زدہ نظروں سے دیکھنے لگے اور سوچنے لگے کہ جسے وہ سؤر کا گوشت سمجھ رہے تھے اصل میں وہ ایک انسان کا گوشت تھا جس کا کسی کو خیال ہی نہیں تھا۔

لہو کی مہندی

وشال ملہوترہ صاحب کی اکلوتی اولاد تھی جسے انھوں نے بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا، اس کی ہر فرمائش ملہوترہ صاحب پلک جھپکتے ہی پوری کر دیتے۔ وشال لاڈ پیار کی وجہ سے کافی ضدّی بن چکا تھا، اگر اس کا موڈ خراب ہو جاتا تو گھر کی کوئی بھی قیمتی شے سلامت نہیں رہتی۔ وشال کی ماں ہر وقت ملہوترہ صاحب کو کوستی کہ آپ نے "وشو" کو سر چڑھا رکھا ہے کہ جو بھی چیز اس کے ہاتھ لگتی ہے اس کی خیر نہیں.... ملہوترہ صاحب یہی جواب دیتے ... "بچّہ ہی تو ہے، توڑ دیا تو کیا ہوا، نئی لے آئیں گے بازار سے ...." شانتی ملہوترہ صاحب کے آگے ہتھیار ڈال دیتی ... "آپ ہی تو کہتے تھے کہ بچّے کو تھوڑا رعب بھی رکھنا چاہئے۔ اچھّا اب تمہارے جی میں جو آئے کرو۔ میں کچھ نہیں بولوں گی۔" شانتی جلے بھُنے لہجے میں کہہ کر رسوئی میں گھس جاتی، ملہوترہ صاحب بھی پیچھے پیچھے جاتے اور کہتے ... "ارے ناراض ہو گئی ..." وہ مسکا لگاتے ہوئے کہتے ... "آج کیا بنا رہی ہے۔ ہماری رانی کھانے میں ..... آ ..... ہا ... ہا ... بُھرتے کی خوشبو آ رہی ہے ... کچھ بھی ہے کھانا بنانے میں جواب نہیں ہماری رانی کا ...."

کو سزا دلاتے۔

پچھلے دنوں جب انھوں نے چار خطرناک دہشت گردوں کو لمبی سزا دلائی تو پورے شہر میں ان کی بہادری کے چرچے ہونے لگے۔ تب سے کچھ لوگ ان کی جان کے دشمن ہو گئے جنھوں نے فیصلے سے پہلے مہرہ کو رشوت دینے کی کوشش کی تھی اور مہرہ صاحب غصّے سے لال پیلے ہو گئے تھے وہ سرکاری وکیل تھے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ ان دہشت گردوں کو لمبی سے لمبی سزا دلائیں گے ۔ ۔ ۔ ۔

امتحانات کا نتیجہ نکل چکا تھا' وشال کی اوّل پوزیشن تھی۔ اور کامنی جو اس کی منگیتر تھی' دوسرے نمبر پر رہی تھی' ملہوترہ صاحب نے اسی خوشی میں ایک عظیم الشان پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں انہوں نے مہرہ صاحب کو خاص طور سے مدعو کیا تھا۔ مہرہ صاحب اپنی بیٹی کامنی کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے تو وشال نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ کامنی نے وشال کو اپنے ڈیڈی سے ملایا اور مہرہ صاحب نے مبارک باد دیتے ہوئے وشال کا کاندھا تھپتھپایا۔ مہرہ صاحب سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے تو وشال کامنی کو ماں سے ملانے لے گیا۔

"ماں! یہ کامنی ہے۔ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی ہے اور ہم دونوں ۔ ۔ ۔ ۔"

اتنا کہہ کر وہ شرما گیا۔ ماں نے کامنی کی بلائیں لیں۔ وشال سمجھ رہا تھا کہ ماں کو اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ لیکن وشال کو کیا معلوم کہ اس کے دوست نے ماں کو ساری داستانِ لیلےٰ مجنوں پہلے ہی سنا دی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ رات دیر تک پارٹی چلی۔ ملہوترہ صاحب مہرہ صاحب کے ساتھ ہال کے ایک کونے میں کھڑے کچھ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ پھر دونوں ہنس کر بغلگیر ہوئے۔ ملہوترہ صاحب سیدھا آ کر مائیک کے آگے کھڑے ہوئے۔ "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! اس مبارک موقعہ پر میں آپ کو ایک اور خوشخبری سنانے جا رہا ہوں"۔ سارے ہال میں خاموشی چھا گئی جیسے کوئی خاص بات ہو۔ ملہوترہ صاحب پھر بولے:

جب وشال کو معمولی چوٹ آئی تو کئی روز تک شانتی کو ہوش نہیں آیا۔ جب وہ پوری طرح ہوش میں آئی تو غور سے دیکھا تو معمولی سی خراش تھی۔ وشال رفتہ رفتہ کالج تک پہنچ گیا۔ اب اس کی عادتیں بھی بدل گئیں تھیں۔ اب وہ بالکل ضد نہیں کرتا تھا۔ بلکہ الٹا ماں کو نصیحتیں کرتا۔ وہ کافی سمجھدار ہو چکا تھا۔ دن رات محنت کرکے وہ پڑھائی کرتا۔ اب اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا......

ملہوترہ صاحب کی خواہش تھی کہ وشال ڈاکٹر بنے، لاچار اور بے بسوں کی خدمت کرے، ان کا دکھ درد بانٹے... وشال کو بھی ڈاکٹر بننے کا بہت شوق تھا۔ ملہوترہ صاحب خود تو پیشے سے انجینئر تھے لیکن وہ ڈاکٹر کی زندگی سے کافی متأثر تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اکثر لوگ اوروں کے لئے جیتے ہیں ان کی نظروں میں ڈاکٹر مسیحا تھا۔ وہ کہتے اگر ثواب کمانا ہے اور سورگ میں جگہ بنانی ہے تو پھر مریضوں کی سیوا کرو ... وشال اپنے کالج میں سب سے زیادہ اسمارٹ تھا۔ اس کا چہرہ پُر کشش تھا، تبھی تو کالج کی مغرور کہلانے والی کامنی اس پر مرمٹتی تھی۔ بے حد خوبصورت تھی۔ کیچڑ میں کھلے ہوئے کنول کی طرح اس کا صندلی چہرہ موٹی موٹی آنکھیں جیسے شراب کے پیالے ہوں۔ کالی سیاہ زلفیں جنھیں وہ شانے پر پھیلا کر رکھتی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بادلوں میں سے چاند جھانک رہا ہو اس کی ناگن جیسی زلفیں ہر آنے جانے والے لڑکے کو ناگن بن کر ڈستیں....

بچتے بچتے بھی وشال کو دل کا روگ لگ ہی گیا۔ وہ کامنی کے زلفوں کے جال میں اُلجھ کر رہ گیا۔ رفتہ رفتہ حالات ایسے ہو گئے کہ کالج کے ہر لڑکے لڑکی کی زبان پر ان کی محبّت کا چرچا رہتا... کالج کے کئی لڑکے تو انہیں حسد سے دیکھتے لیکن کامنی کب کسی کی پرواہ کرتی.... کامنی مہرہ صاحب کی لختِ جگر تھی۔ مہرہ صاحب شہر کے مانے ہوئے سرکاری وکیل تھے۔ وہ بے حد نڈر تھے۔ بہادر تھے۔ وہ ہمیشہ سچائی کا ساتھ دیتے اور مجبوروں

بھگائے جائیں گے۔ وشال کے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہی قیدی ہے جسے مہرہ صاحب نے لمبی سزا دلائی تھی۔ وشال کو اس سے سخت نفرت ہوئی۔ اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ فراڈ سرٹیفیکٹ کبھی نہیں دے گا۔ وہ اپنے پیشے سے کبھی غدّاری نہیں کرے گا۔ وشال نے اس خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور اس قیدی کی طرف خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر نکل گیا۔

ملہوترہ صاحب نے مہرہ صاحب کے ساتھ مل کر شادی کی تاریخ پکّی کر دی تھی۔ کیونکہ شانتی کو اپنے بیٹے کا سہرا دیکھنے کی تمنّا تھی وہ ہر وقت یہی کہتی کل کس نے دیکھا ہے۔ نہ جانے کب آنکھیں بند ہو جائیں اور حسرت دل میں ہی رہ جائے۔

ملہوترہ صاحب اس کے منہ پر ہاتھ دیتے۔ "شانتی! تمہیں کیا ہو گیا ہے جب دیکھو ایسی باتیں کرتی رہتی ہو۔۔۔۔ دونوں طرف بڑے زور و شور سے تیاری ہو رہی تھی۔ وشال نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جہیز بالکل نہیں لے گا۔۔۔ ملہوترہ صاحب کو بھی بالکل جہیز کی لالچ نہیں تھی۔ وہ وشال کے اس فیصلے سے بہت خوش تھے۔ زیورات کپڑے گھر کے چھوٹے بڑے سامان کی خرید و فروخت شروع تھی۔ وشال نے اپنے دوستوں کے لئے کپڑے خریدے تھے۔ شانتی نے پڑوس کی غریب عورتوں کے لئے بھی ایک ایک عدد کپڑوں کا جوڑا خرید لیا۔ وہ کافی رحم دل تھیں۔۔۔۔ ادھر مہرہ صاحب کے گھر میں ہر سو ہنگامہ بپا تھا۔ ہر طرف نقرئی قہقہے ابل رہے تھے۔ نئی عمر کی شوخ و چنچل لڑکیاں اپنی دلکش آواز سے ماحول کو رومان پرور بنا رہی تھی۔

سارا گھر ڈھولک کی تھاپ سے گونج رہا تھا۔ کامنی کی سہیلیاں شادی کے جوڑوں کو رنگ برنگے دوپٹوں کے ساتھ ملاپ کر کے رکھ رہی تھیں۔ کامنی کے سہیلیوں نے سارا گھر تحائف سے بھر دیا تھا۔۔۔۔ تیاری نے آج زیادہ ہی زور پکڑ لیا تھا کیونکہ آج مہندی کی رات تھی۔ اور کل بارات آنے والی تھی۔ کامنی کی سہیلیاں

"آج میں اپنے بیٹے وشال ملہوترہ کی منگنی مہرہ صاحب کی بیٹی کامنی مہرہ سے کرنے
کا اعلان کر رہا ہوں۔" پھر سارے ہال میں شور و غل مچ گیا۔ جام سے جام ٹکرانے
لگے۔ کچھ جوڑے مغربی موسیقی کی دھن پر تھرکنے لگے۔ کچھ نوجوان جوڑے وشال اور
کامنی کی جوڑی کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے کہہ رہے ہوں
... کاش ہماری منگنی کا اعلان ہوا ہوتا .... ملہوترہ صاحب نے اپنے
ڈرائیور کو مہرہ صاحب کو گھر تک چھوڑنے کیلئے کہا۔ وشال بھی انہیں گیٹ تک
چھوڑنے گیا۔.... وشال کا ذہن عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ کہ گھر والوں
کو اس کی محبّت کا علم کیسے ہو گیا۔.... وشال اور کامنی دونوں نے ڈاکٹری
کورس مکمّل کرنے کے بعد ایک ہی ہسپتال میں پریکٹس شروع کر دی تھی ....
ملہوترہ صاحب نے وشال کے لئے ایک پرائیویٹ کلینک بھی کھولا جہاں
وشال چھٹی کے بعد غریب مریضوں کی خدمت مناسب فیس لے کر کرتا۔ کبھی
کبھار کامنی بھی کلینک میں آجاتی اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتیں..... اب
وشال کو شہر کے بڑے جیل میں تعینات کر دیا گیا تھا جہاں وہ قیدیوں کا علاج
وغیرہ کرتا۔ اسے بڑی خوشی محسوس ہوئی کہ وہ جیل میں قیدیوں کی سیوا کر سکے گا
اور ان کا دکھ درد بانٹ سکے گا۔.... جیل کے قیدی وشال سے کافی متاثر
ہوئے تھے۔ وشال میں کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا وہ سب کو ایک نظر سے دیکھتا
ایک دن تو وشال بھونچکا رہ گیا۔ جب ایک قیدی نے اسے کہا کہ وہ شہر کے
بڑے ہسپتال ایس۔ ایم جی میں داخل ہونا چاہتا ہے، اسے سرٹیفیکٹ دیا
جائے کہ وہ ٹی۔ بی کا مریض ہے۔ وشال کو یاد آگیا کہ اس کے نام کسی نے دستی
خط دیا تھا وہ اسے اپنا بھائی بتا رہا تھا۔ وشال نے وہ خط کھول کر پڑھا تو
اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس کو اپنے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی خط
میں صاف لکھا تھا کہ کسی طرح ہسپتال میں داخل ہو جائے تو ہم تمہیں وہاں سے

گزرتے ہوئے اچانک وشال ٹھٹھک گیا۔ اس کا جسم پسینے سے تر ہو گیا۔ اس کا گلا سوکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے موت رقص کرنے لگی۔ سامنے سے دو اسکوٹر سوار جنھوں نے اپنے چہرے پر نقاب چڑھا رکھی تھی' ہاتھوں میں اسالٹ رائفلیں لئے آگے بڑھ رہے تھے۔ بازار کے تمام دکاندار ان کو دیکھ کر سہم گئے۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ اچانک انھوں نے وشال پر قریب اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی اور اونچی آواز میں کہا۔ ۔ ۔ "سالا سرٹیفیکٹ نہیں دے گا۔ اب سنبھال موت کا سرٹیفیکٹ۔ ۔ ۔ ۔ دہشت گردوں کے جانے کے بعد وہاں لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ وشال کو سارا شہر جانتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لوگ بے بس کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے جو مسیحا کسی کو نئی زندگی دے کر آرہا تھا اب زمین پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ۔ ۔ ۔ اس حادثے کی خبر جب وشال کے گھر تک پہنچی تو شانتی سیڑھیوں سے رینگتے ہوئے نیچے آ کر گر پڑی ملہوترہ صاحب کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔ ۔ ۔ ۔ جس گھر سے کل بارات نکلنے والی تھی اب وہاں ارتھی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ادھر کامنی ہاتھوں پاؤں میں محبوب کی مہندی رچائے سپنوں کی دُنیا سجائے بیٹھی تھی کہ اچانک اسے معلوم ہوا تو اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کی مہندی لہو میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے خوابوں کی دنیا ذرّہ ذرّہ ہو کر بکھر گئی۔ بوکھلاہٹ میں وہ مکان کی ساتویں منزل پر چڑھ گئی اور وہیں سے چھلانگ لگا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے خوشیوں کے گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ تینوں ارتھیاں اٹھائے لوگ ایک قطار میں شمشان گھاٹ کی طرف جا رہے تھے۔ تمام شہر کے لوگ اس حادثے پر افسوس کر رہے تھے۔ ملہوترہ صاحب اور مہرہ صاحب اپنی قسمت پر آنسو بہا رہے تھے۔ لوگوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔

اس کے ہاتھوں پاؤں میں مہندی سے نقشے بنا رہی تھیں اور اپنی سریلی آواز میں مہندی کے گیت گا رہی تھیں۔ ... وشال اپنے دوستوں کے ہمراہ کل کے لئے تیاریاں کر رہا تھا۔ شانتی کے تو پاؤں ہی زمین پر نہیں لگتے تھے۔ اس نے گھر میں ایک کہرام مچا رکھا تھا۔ وشال دوستوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا کہ اچانک ایک ضعیف العمر شخص گیٹ سے داخل ہوا اور وشال کو دیکھتے ہی چلّانے لگا..... "ڈاکٹر صاحب.... میرے بچّے کو بچا لیجئے.... بھگوان کے لئے میرے بچّے کو بچا لیجئے..... وہ مر جائے گا.... وہ مر جائے گا.... اسے بچا لیجئے... بوڑھے کی درد بھری آواز سن کر وشال کا دل پسیج گیا۔ اسے رہا نہیں گیا۔ اس نے دوستوں سے انتظار کرنے کو کہا اور خود اسکوٹر لے کر بوڑھے کے ساتھ ہو گیا... بابا تم فکر مت کرو۔ وہی ہوگا جو بھگوان کو منظور ہوگا۔ وشال راستے بھر اسے تسلّی دیتا رہا۔ وہ اپنا سارا کام چھوڑ کر اس بوڑھے کے ساتھ کسی کو نئی زندگی دینے جا رہا تھا۔ شاید ملہوترہ صاحب ٹھیک ہی کہتے تھے کہ ڈاکٹر کا جینا لوگوں لئے ہوتا ہے۔ جلد ہی وہ بوڑھے کے گھر پہنچ گیا۔ ..... بچّہ بخار سے تپ رہا تھا۔ وشال نے اپنے ہاتھوں سے پٹیاں بھگو کر اس کے ماتھے پر رکھیں۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد بچے کو ہوش آیا۔ بوڑھے کی جان میں جان آئی.... وشال نے نسخہ بوڑھے کو دیتے ہوئے کہا: "بابا یہ دوائیاں بازار سے منگوا لینا..." "میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔" بوڑھے نے نسخہ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا: وشال نے پرس سے کچھ روپئے نکال کر بوڑھے کو تھما دئیے..... "یہ لو جب ہوں گے لوٹا دینا۔ اگر ضرورت پڑی تو مجھے گھر سے بلا لینا۔" کہہ کر اس نے اسکوٹر سٹارٹ کیا........ بوڑھا اسے لمبی عمر کی دُعائیں دیتا رہا۔

اگلے ہی لمحے اسکوٹر ویران سڑک پر دوڑ رہا تھا۔ بازار کے چوک سے

سانجھی دھرتی

انسان کی جائے پیدائش ایک جگہ ہے جس کو انسان کبھی فراموش نہیں کر سکتا ۔ انسان کہیں بھی رہے اس کو اپنا وطن اور شہر شدّت سے یاد آتے ہیں ۔ انسان کو اپنے وطن اور شہر سے اتنی ہی محبّت ہے جتنی ایک ماں کو اپنے بچّے سے ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ہر انسان کی طرح خالد کا بھی ایک وطن تھا، ایک شہر تھا ۔ ۔ ۔ پردیس میں رہ کر اس کا دل ہر وقت اپنے وطن جانے کے لئے بیقرار رہتا ۔ ۔ ۔ خالد ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا ۔ اپنی پڑھائی پوری کرنے کے بعد اس نے نوکری کے لئے بہت کوشش کی مگر نہ تو اس کے پاس رشوت دینے کیلئے پیسے تھے اور نہ کسی لیڈر کی سفارش ۔ ۔ ۔ ہر طرف سے نا امّید ہو کر خالد نے ایک ایجنٹ کے ساتھ سعودی عرب جانے کا فیصلہ کر لیا ۔ اس نے دیکھا کہ اس شہر میں اس جیسے کئی لڑکے بے روزگار پھر رہے ہیں ۔ جانے سے ایک دن پہلے خالد سوچنے لگا ۔ پتہ نہیں وہاں کے لوگ کیسے ہونگے ۔ میرے وطن جیسے ۔ ۔ ۔ ۔ میرے شہر جیسا شہر ہوگا کہ نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ دل پر پتّھر رکھ کر اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا ۔ ۔ ۔ خالد کو اچھی طرح یاد ہے جب وہ اپنے وطن اور شہر سے پانچ سال پہلے رخصت ہوا تھا تو ماں کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو نکل کر سینے میں جذب ہو جاتے ۔ اس کی چھوٹی بہن منی ماں کو سمجھاتی کہ ماں خالد بھیّا تو سعودی عرب کام کرنے کے لئے جا رہے ہیں اور پانچ سال بعد خیریت سے ڈھیر ساری دولت کما کر واپس گھر لوٹے گا ۔ پھر ماں نے خالد کا ماتھا چوما اور دوپٹہ آسمان کی طرف پھیلا کر دعا کرنے لگی ۔ ۔ ۔ خُدا کرے تو اپنے مقصد میں کامیاب

پولیس

"ارے تم پولیس میں"
'الف' کو پولیس کی وردی میں دیکھ کر 'ب'
چونک پڑا۔
"حیران کیوں ہو گئے"۔ الف نے ب سے پوچھا
"اس لئے کہ تم تو پہلے ۔۔۔۔۔"
"ہاں! ہاں! میں پہلے ایک غنڈہ تھا' تو کیا
ہوا۔ ہم جیسے غنڈے' بدمعاش ہی تو پولیس
کے قابل ہوتے ہیں۔"

کی طرح چمکنے لگتی۔ آس پاس دھان کے مستی میں جھومتے کھیت ..... زعفران کے پھولوں کی دور دور تک پھیلی ہوئی مہک جو کسی بھی اجنبی کا دل موہ لے .... اس پر وہاں کی لڑکیوں کا سریلی آواز میں "رف" وہاں کے حسن میں اضافہ کر رہا تھا ... خالد کا وہ شہر جہاں ہندو اور مسلمان بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے۔ اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں برابر شریک ہوتے .... جہاں لوگوں کے دلوں کے اندر سے محبّت کا جہلم اور چناب نکلتا تھا۔ خالد کو شاعر کے وہ شعر یاد آگئے جو شاید شاعر نے اسی شہر کے لئے کہے تھے۔

یہ دھرتی ہندوؤں سکھوں کی بھی سانجھی میراث ہے
کئے دیتے ہو کیوں اس کو مسلمانوں سے وابستہ
ہمارے شہر کی عزّت و توقیر میسّر برسوں سے
رہی ہے ہندوؤں سکھوں مسلمانوں سے وابستہ

پھر خالد کو اپنا دوست روپ کرشن یاد آگیا جو ہر وقت اس کے لئے جان تک دینے کے لئے تیار تھا۔ دینا ناتھ جسے خالد ماما کہتا تھا دن میں ایک بار ضرور خالد کے گھر آتا اور خیریت معلوم کرتا

اپنے شہر کی ایک ایک بات خالد کے دماغ پر کسی اشتہار کی مانند چپک کر رہ گئی تھی ..... کافی دنوں تک خالد اپنے ذہن سے اپنے وطن کی باتیں نہیں نکال سکا ... سعودی عرب میں پانچ سال کیسے گزر گئے خالد کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا۔ خالد نے کافی پیسہ کما لیا تھا اور اب پانچ سال بعد پھر وہ اپنے وطن جانے کے لئے پر تول رہا تھا۔

جہاز کے سفر کے بعد جس وقت خالد نے اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھا

ہو کر لوٹے.... فردوس کی باتیں بھی خالد کو اچھی طرح یاد تھیں۔ جانے سے پہلے اس نے خالد کو ایک طرف بلا کر کہا تھا: " خالد! میری بات کان کھول کر سن لو۔ اگر تم نے وہاں جا کر مجھے خط نہ لکھا تو میں سمجھوں گی تم مجھے بھول گئے...."
پھر دینا ناتھ نے خالد کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا: " خالد بیٹا! وہاں جا کر بھول مت جانا.... گھر کی کوئی فکر مت کرنا۔ میرے ہوتے ہوئے تیری بہن کو کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوگی...." پھر خالد نے گاڑی پر چڑھنے سے پہلے ایک نظر اپنے شہر پر ڈالی تو اس نے دیکھا شہر کا چپّہ چپّہ خوشیوں سے سرشار ہو کر باہر سے آنے والے سیّاحوں کے استقبال کے لئے بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا... دور دور تک پھیلی ہوئی نیلے پانی کی وہ جھیل جس کی آغوش میں ہزاروں شکارے دلہنوں کی طرح سجے ہوئے تیر رہے تھے اور سینکڑوں ہاؤس بوٹ اپنے مہمانوں کے انتظار میں آنکھیں بچھائے منتظر تھے۔ جھیل کا جھلمل کرتا وہ پانی.... چناروں کے پتّے ہوا سے محو گفتگو.... چناروں کی ٹھنڈی اور تسکین بخش چھاؤں جس کے تلے بیٹھ کر ہر تھکا ہوا مُسافر سکون محسوس کرتا تھا.... سفیدے کے درختوں کی قطاریں آسمان کو چھونے کی ناکام کوشش میں مصروف.... سامنے کی پہاڑی پر سفید رنگ کا وہ مندر جس پر کیسری رنگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اور جہاں پہنچ کر ہر انسان اپنے دل کی مراد پا لیتا.... یہاں کی وہ زیارتیں جہاں دن رات عقیدتمندوں کی ایک اچھّی خاصی بھیڑ موجود رہتی اور انسان سب کچھ بھول کر اللہ کی عبادت میں کھو جاتا..... اس شہر کے وہ باغ جہاں کی کلیاں چٹکنے کے لئے ہر وقت بیقرار رہتیں.... باغوں میں وہ سیّاحوں کی ٹولیاں گلے میں کیمرے لٹکائے قدرت کے حسین مناظر کو قید کر لیتے.... دور دور تک پھیلے ہوئے وہ پہاڑوں کا سلسلہ جن پر آج بھی سردیوں کی برف کسی چٹان کی مانند جمی ہوئی تھی اور سورج کی کرنیں پڑتے ہی سنگ مرمر

اور شناختی کارڈ چیک کرتے رہے . . . . خیر خیر کرے گاڑی اڈہ پر پہنچ گئی تو خالد گاڑی سے اترا۔ اس کو اپنا شہر کچھ اجنبی سا لگ رہا تھا۔ اسے یہاں کا ماحول کچھ پھیکا پھیکا نظر آ رہا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ آس پاس کا منظر دیکھ کر اسے عجیب سا محسوس ہوا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ قدرت کے یہ حسین منظر ہم سے اتنی جلدی روٹھ جائیں گے وہ سوچنے لگا پتہ نہیں اس کے شہر کا پانی بالکل خاموش اور خوف سے ڈولتی کشتیاں . . . ویران ہاوس بوٹ اور شکارے . . . چناروں کی ٹھنڈی اور میٹھی چھاؤں غائب . . . . سہمے سہمے چناروں کے برگ . . . خوف اور دہشت سے کانپتے سفیدے کے اشجار . . . . شرم سے سر جھکائے سب کے سب کوہسار . . . پہاڑی والا وہ مندر جہاں شنکھ کی آواز بند ہے اور پتہ نہیں کئی دنوں سے کسی نے پرشاد نہیں چڑھایا . . . . وہاں کے باغوں کے مرجھائے ہوئے پھول . . . سیاحوں کی وہ ٹولیاں غائب ؛ زعفران کے پھولوں کی مہک کی جگہ اب زہر آلود دھتورے نے لے لی ہے۔ لڑکیوں کے گیت اب آہوں اور چیخوں میں بدل گئے ہیں۔

ویران بازار لہو لہان سڑکیں . . . . لوگوں کے دلوں سے محبّت کے جہلم اور چناب کی جگہ اب نفرت نکلتی اور چار سو خون کا دریا . . . . جگہ جگہ خاکستر دکانیں اور مکان . . . . خالد نے اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ دئے۔ اور آسمان کی طرف منہ کر کے پوچھنے لگا . . . کون ہیں یہ لوگ جنھوں نے میرے جنّت جیسے شہر کو جہنّم بنا ڈالا . . . . اُسی عالم میں چلتا چلتا وہ دینا ناتھ کے مکان کے پاس پہنچا تو حیران رہ گیا کہ دینا ناتھ کے مکان میں ملٹری بسی ہوئی تھی۔ اور چھت پر مورچہ بنا ہوا ہے۔ خالد نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک شخص سے پوچھا "میرے ماما دینا ناتھ جی کہاں چلے گئے ہیں ؟" اس شخص نے بتایا کہ وہ لوگ یہاں

تھا اسے قدرے سکون محسوس ہوا اور اس کے دل میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ اس کے بعد خالد نے اپنے شہر جانے والی گاڑی پکڑی۔ خالد نے اپنا سارا سامان گاڑی پر چڑھایا اور خود سیٹ پر بیٹھ گیا۔۔۔ سفر کافی لمبا تھا اس لئے خالد سوچوں کے سمندر میں ڈوب گیا۔ اور سوچنے لگا پتہ نہیں کافی دیر سے گھر سے کسی کا خط نہیں ملا۔۔۔۔ نہ ماں کا۔۔۔۔ نہ روپ کشن کا۔۔۔۔ اور نہ ہی ماما دینا ناتھ کا۔۔۔ خیریت ہونی چاہئے۔ سوچتے سوچتے اچانک اس کی آنکھ لگ گئی۔۔۔۔ اچانک ایک جگہ گاڑی جھٹکے کے ساتھ رکی تو خالد نے آنکھ کھولی اپنا سر اوپر اٹھایا تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کچھ ملٹری والے گاڑی میں گھس آئے ہیں اور لوگوں سے شناختی کارڈ پوچھنے لگے۔ خالد سوچنے لگا پانچ سال قبل جب وہ یہاں سے گیا تھا تو اس وقت کوئی شناختی کارڈ نہیں دیکھتا تھا۔ پر اب کیوں؟ تھوڑی دیر بعد ایک ملٹری والا خالد کے پاس پہنچا اور خالد نے سہمے ہوئے کہا: "میں پانچ سال قبل یہاں سے کام کرنے کے لئے سعودی عرب گیا تھا اس لئے میرے پاس شناختی کارڈ نہیں ہے۔ ہاں! مگر میرے پاس پاسپورٹ ہے اگر آپ دیکھنا چاہیں تو حاضر ہے۔۔۔" خالد نے پاسپورٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ ملٹری والے نے مہر دیکھی اور آگے بڑھ گیا۔ پھر پیچھے جاکر اس نے ایک مسافر کو گاڑی سے نیچے اتارا۔۔۔۔ اس سے پوچھا کہ اس کے پاس شناختی کارڈ کیوں نہیں ہے؟ مسافر دہائی دیتا رہا کہ اس کا شناختی کارڈ گم ہو گیا ہے۔ لیکن ملٹری والے نے اس کی ایک نہ سُنی اور گاڑی کو آگے بڑھ جانے کا حکم دیا۔۔۔۔ گاڑی چل پڑی تو خالد کے ذہن پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ اسے مسافر پر کافی ترس آرہا تھا مگر وہ بے بس تھا وہ سوچنے لگا پچھلے پانچ سال میں یہاں کونسا نیا قانون نافذ ہوا ہے کہ اس کو اس کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں۔۔۔ پھر پتہ نہیں کتنی بار ملٹری والے گاڑی میں آئے

طوائف

شام کی پر فضا ہوا سے سارا شہر معطر ہو رہا تھا۔ شام کا دھندلکا ساری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ سرد ہوا کے جھونکے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ بازار میں لوگوں کی آمد رفت کافی حد تک بڑھ چکی تھی۔ سبزی منڈی سے تھوڑی ہی دور ہیرا بائی اپنے کوٹھے پر بیٹھی پان کے سبز پتّوں پر کتھا اور چونا لگا رہی تھی۔ جوانی میں تو وہ گاہکوں کو خوب چونا لگاتی اور کتھا سناتی تھی لیکن اب اس کے سر کے بال چاندی کی طرح چمکنے لگے تھے۔ اس کی جبین پر بل پڑ چکے تھے۔ گالوں کی لالی زردی میں تبدیل ہو چکی تھی جس سے اس کے حُسن کی چمک پھیکی پڑنے لگی تھی۔ جب کلی میں رس ختم ہو جائے تو بھنورے ادھر کا رُخ بھی نہیں کرتے۔ یہی حال طوائف کا بھی ہوتا ہے۔ جب اس کی جوانی پُر شباب ہوتی ہے تو دن رات چاہنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ اور جب جوانی کی بہار ڈھلنے لگتی ہے تو اس کے چاہنے والے اس طرح غائب ہو جاتے ہیں جس طرح گدھے کے سر سے سینگ.... جب بھی ہیرا بائی کے گلشن میں کوئی نئی کلی چٹکنے لگتی تو اس کی مہک سونگھ کر کوٹھے کے ارد گرد بھنورے بے اختیار منڈلانے لگتے۔ ہیرا بائی کے زیر سایہ تربیت پانے والی پانے والی رقاصاؤں کا رقص دیکھنے کا مزا ہی کچھ اور تھا۔ اکثر شہر کے باعزت اور شریف لوگ رات کی تاریکی میں اُجلے لباس پہن کر اس بزم میں آتے اور اس بزم کی شراب سے لطف اندوز ہوتے.... رات کے اندھیرے میں وہ چاہے کچھ کرلیں مگر سحر ہوتے ہی وہ اپنے چہروں پر عزّت اور شرافت کا نقاب چڑھا لیتے۔ باہر گلی میں شور سن کر ہیرا بائی پاندان کو ایک طرف رکھتے ہوئے اٹھی اور کھڑکی سے باہر جھانکی....

کے لوگوں سے ڈر کر اپنا سب کچھ یہاں چھوڑ کر یہ شہر چھوڑ کر چلے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بات سُن کر خالد کے دل کو دھچکا لگا ۔ ۔ ۔ اسے بے حد دکھ ہوا ۔ آگے چل کر اسے معلوم ہوا کہ اس کا دوست روپ کشن بھی وہاں سے بھاگ گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ خالد سوچنے لگا کل تک تو یہ شہر ہم سب کا سانجھا شہر تھا ۔ سانجھی دھرتی تھی ۔ ہندو اور مسلمان بھائی بھائی کی طرح رہتے تھے ۔ مسجد کی اذان مندر کے شنکھ ایک ساتھ فضا میں گونجتے تھے ۔ وہ پھر سوچنے لگا کون ہیں یہ لوگ جنھوں نے بھائی بھائی کو آپس میں لڑایا ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے مکان دیکھ کر وہ حیران رہ گیا اور بدحواسی کے عالم میں زور زور سے چلّانے لگا ۔ کون ہو تم لوگ جنھوں نے اس سانجھی دھرتی کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی کوشش کی ۔ تم مٹھی بھر لوگ اس سانجھی دھرتی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ۔ ۔ ۔ سامنے آؤ میں تمہارا خون پی جاؤں گا ۔ ۔ ۔ میں اس دھرتی کا بیٹا تمہیں چنوتی دیتا ہوں کہ اگر ہمّت ہے تو سامنے آؤ ۔ ۔ ۔ پھر خالد پاگلوں کی طرح چلّانے لگا ۔ ۔ نکل جاؤ میرے شہر سے نکل جاؤ ۔ ۔ ۔ ماں ! میں واپس آگیا ہوں ۔ تم کہاں ہو ؟ ۔ ۔ ۔ مُنی ! کہاں ہو تم ؟ میں بہت سارا روپیہ کما کر لایا ہوں ۔ ۔ ۔ اتنے میں کچھ نقاب پوش وہاں سے گولیاں چلاتے ہوئے بھاگے ۔ ان کے پیچھے ہی کچھ ملٹری والے بھی دوڑ پڑے ۔ ان سب کے پیچھے خالد ہاتھ میں پتّھر اٹھا کر دوڑ پڑا ۔ ۔ ۔ ٹھہرو ! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا ۔ وہ زور زور سے چلّانے لگا ۔ ۔ ۔ اچانک ایک گولی سنسناتی ہوئی خالد کے سینے میں اتر گئی ۔ اسے معلوم بھی نہ ہو سکا کہ گولی کس کی تھی وہ کراہتا ہوا دوست روپ کشن کی دہلیز تک پہنچا اور دروازے کے پاس پہنچ کر دھڑام سے گر پڑا اور دھیمی دھیمی آواز میں کہتا رہا ۔ یہ سانجی دھرتی ہے ۔ ۔ ۔ یہ دھرتی سانجھی ہے ۔ ۔ ۔ تم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے ۔

جگّا حیرانگی سے بولا.... ارے ہیرا بھائی بڑھاپے میں تیری آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ پان کے پتّوں کو چونا لگاتے لگاتے تجھے بھی چونا لگ گیا ہے..... یہ تو خالص ہیرا ہے ہیرا.... اس ہیرے سے تمہارا سارا کوٹھا جگمگا اٹھے گا۔ گاہکوں کی بھیڑ لگ جائے گی۔ اچھّا جگّا یہ بتا یہ لڑکی تو کافی چالاک معلوم ہوتی ہے۔ پھر تیرے قابو میں کیسے آ گئی۔ ہیرا بائی نے دریافت کیا۔ ہیرا بائی آجکل کی لڑکیاں جہیز کے کارن بے بس ہو چکی ہیں اور پھر پیار کے دو میٹھے بول سنا دو یا محبّت بھرے چار الفاظ لکھ دیئے تو لڑکی خوش اور بغیر جہیز کے شادی کی پیش کش کی تو وہ فوراً قبول کر لیتی ہیں۔ یہ بھی گھر سے بھاگ کر آئی ہے۔ سالی چلی تھی بغیر جہیز کے جگّا سے شادی کرنے۔ جگّا نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا.... پھر جگّا نے لڑکی کو پانچ ہزار میں فروخت کر دیا۔ اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوا کہ جس عورت کو وہ بازار میں نیلام کرتے جا رہا ہے یہی عورت اس کی ماں ہے، یہی عورت اس کی بہن ہے، عورت کل اس کی بیٹی ہو سکتی ہے.... یہی عورت حوّا ہے۔ یہی عورت آدم کے چمن کی ایک کلی ہے۔ یہ وہی عورت ہے جس نے حضرت عیسٰیؑ کو جنم دیا۔ یہی عورت سیتا کی طرح پاک اور مریم کی طرح مقدّس ہے اور نہ ہی ہیرا بائی کو اس بات کا احساس ہوا کہ وہ خود بھی ایک عورت ہی نہیں، ایک بیٹی کی ماں بھی ہے۔ ہوتا بھی کیوں؛ اس نے تو عہد کر لیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو اس پیشے سے دور رکھے گی۔ جگّا نوٹ گنتا ہوا سیڑھیاں اترنے لگا تو سامنے اس کی نظر آتے ہوئے "دلاور" پر پڑی۔ وہ اسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور جلدی جلدی روپے جیبوں میں ٹھونسنے لگا اور کپڑے درست کرتا ہوا نیچے اتر گیا۔ "دلاور" کے پاس سے گزرتے وقت اس کا ہاتھ بے اختیار سلام کے لئے اٹھ گیا.... "دلاور" کو دیکھ کر محلے کے بچّے ادھر ادھر ہو گئے۔ گلی پوری طرح صاف ہو چکی تھی۔ "دلاور" اس شہر کا

جگا پر نظر پڑتے ہی ہیرا بھائی کی آنکھوں میں چمک آگئی اور اس کی باچھیں کھل گئیں - جلد ہی اس نے اپنی نظر دروازے پر مرکوز کر دی . . . دروازے سے داخل ہوتے ہی جگّا نے اپنے ساتھ لائی ہوئی لڑکی سے کہا - یہ میری آنٹی کا محل ہے، جاؤ، جاکر پاؤں چھو لو . . . . لڑکی نے آگے بڑھ کر ہیرا بائی کے پاؤں چھوئے . . . . . ہیرا بائی نے آگے بڑھ کر لڑکی کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا . . . ارے جگا ! تو تو چاند کا ٹکڑا لایا ہے - اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر ہیرا بائی ایک کمرے میں لے گئی - کمرے میں قدم رکھتے ہی لڑکی خوشی سے جھوم اٹھی - وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی - کمرے کی دیواروں پر جگّا کی انگنت تصویریں آویزاں تھیں - کمرے میں بچھے ہوئے قیمتی قالین سے محسوس ہو رہا تھا کہ کسی امیر زادے کا محل ہے - لڑکی دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ اس نے جگّا سے شادی کر کے اپنے والدین سے بغاوت کر کے کوئی غلطی نہیں کی - گھر میں پڑی رہتی تو جہیز کی وبا کے باعث کنواری ہی رہ جاتی - اچھا ہوتا اگر دیدی بھی جگّا جیسے کسی نیک اور شریف کا ہاتھ تھام لیتی - اس طرح اس کی زندگی سنور جاتی اور والدین کا بوجھ بھی کم ہو جاتا - نہ جانے وہ کب تک سوچ میں ڈوبی رہتی لیکن ہیرا بائی کی آواز پر وہ چونک پڑی . . . بیٹی اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ بٹن دبا دینا ہیرا بائی نے بٹن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا - اور خود کمرے سے باہر نکل گئی . . . ہیرا بائی کے چنگل میں پھنسنے والی وہ کوئی پہلی لڑکی نہیں تھی بلکہ اس سے قبل بھی کئی لڑکیاں اپنے عاشقوں کے ساتھ گھر سے بھاگ کر اس جہنم کی بھٹی میں جلنے کے لئے پہنچ چکی تھیں . . . . ہیرا بائی نے دوسرے کمرے میں قدم رکھا تو سامنے کھڑا جگّا کو دیکھ کر مسکرائی - جواب میں جگّا بھی مسکرا دیا کیسی لگی نئی چڑیا . . . . جگّا نے سگریٹ کا ٹکڑا جوتے سے مسلتے ہوئے پوچھا - پہلے سے بہتر ہے . . . . . ہیرا بائی نے مختصر جواب دیا . . . بس بہتر . . .

ہیں۔ ایک صدی کی طرح کٹتا ہے ایک لمحہ اور کالی راتیں تو ناگن بن کر ڈستی ہیں۔
کسم کی آنکھوں میں موتی چھلکنے لگے۔ ارے یہ کیا؟ دلاور نے کسم کے رخسار سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو! کشمش ایسے دل چھوٹا کروگی تو کچھ نہ ہوگا۔" دلاور نے کسم کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا: "اگر میں تمہاری نہ ہوسکی تو..... تو..... تو میں زہر کھالوں گی...." نہیں کسم..... دلاور نے کسم کے لبوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ہمیں حالات سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ ہمیں جدائی کی ہر دیوار گرانی ہوگی اور تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔" ابھی وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ ہیرا بائی کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی کسم کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کسم کو دلاور کے بالکل قریب بیٹھے دیکھ کر وہ غصے سے لال پیلی ہوگئی.....کسم..... ہیرا بائی کی بارعب آواز کمرے میں گونج گئی۔ کسم اٹھ کر فوراً اندر چلی گئی' ہیرا بائی کی سمجھ میں سارا معاملہ آگیا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ وہ کسم کو اس راستے پر چلنے نہیں دے گی۔ وقت کا پنچھی اپنا سفر طے کرتا رہا۔ اب ہیرا بائی یہاں سے کھسکنے کیلئے تیار تھی..... دوسرے دن صبح سویرے ہی سارے محل میں شور مچا ہوا تھا کسم بھاگ گئی..... کسم بھاگ گئی۔ ہیرا بائی کو بے ہوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ اسے کچھ لوگ سنبھال رہے تھے۔ دلاور بس کی پشت والی سیٹ پر آرام سے بیٹھا سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا اور کسم سب سے آگے والی سیٹ پر برقعہ پہنے بیٹھی تھی۔ بس بل کھاتے ہوئی سڑکوں پر برق رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ دلاور اور کسم سوچوں کے سمندر میں ڈوبے ہوئے تھے کہ بس ایک جھٹکے سے رکی۔ دلاور اور کسم بس سے اتر کر ایک گلی میں گھس گئے..... دن گزرتے گئے۔ دونوں کی ازدواجی زندگی خوشگوار طریقے سے گزر رہی تھی۔ کسم بہت خوش تھی کہ دلاور سب برے کام چھوڑ کر ایک اچھا انسان بن گیا ہے اور عزت کی زندگی بسر کرنے لگا ہے۔ پھر اسے کوٹھے کی جہنم کی زندگی سے نجات

مانا ہوا دادا تھا۔ سارے شہر پر اس کا دبدبہ تھا۔ "دلاور" بھاری بھرکم جسم کا مالک تھا۔ یہ لمبا قد چوڑا سینہ۔۔۔ موٹی موٹی آنکھیں۔۔۔۔ لمبے لمبے سیاہ بال، فرینچ کٹ داڑھی میں اس کا چہرہ بے حد پُرکشش لگ رہا تھا۔ وہ کئی بار جیل جا چکا تھا۔ شلوار قمیض اور پشاوری چپل میں وہ کابل کا پٹھان لگ رہا تھا۔ لیکن ہر بار گواہ نہ ہونے کے سبب اس کی رہائی ہو جاتی دلاور غریبوں کا ہمدرد تھا ہر انسان کی طرح اس کے سینے میں بھی ایک دل تھا، ایک جذباتی دل۔۔۔۔ ایک ہمدرد دل۔۔ وہ اکثر ہیرا بائی کے کوٹھے پر آتا تھا۔ ہیرا بائی پر اس کے انگنت احسانات تھے جبھی تو ہیرا بائی اس کی بے حد عزت کرتی تھی۔ "دلاور" ہیرا بائی کے ہال نما کمرے میں داخل ہوا۔ ہیرا بائی نے اسے خوش آمدید کہا۔ تشریف رکھئے۔ بندی حقّہ پانی کا بندوبست کرتی ہے۔ ہیرا بائی ہانپتی ہوئی بولی اور خود سیڑھیوں سے اتر کر نیچے چلی گئی۔

اور "دلاور" نیم دراز ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ کشمش او کشمش۔ آواز سنتے ہی کسم کمرے سے باہر آ گئی۔ اور دلاور کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ دلاور اور کسم کی محبّت سے بے خبر تھی تو بیچاری ہیرا بائی۔ دلاور کسم سے بے انتہا محبّت کرتا تھا۔ کسم بھی اس پر پہلی نظر میں ہی فدا ہو چکی تھی۔۔۔ لیکن ہیرا بائی کو پیار کے نام سے نفرت تھی۔ کیونکہ محبّت میں دھوکا کھانے کے بعد ہی وہ اس جہنّم میں پہنچی تھی۔۔۔ کتنے دنوں کے بعد آئے ہو۔۔۔ جانتے ہو یہ دن ہم نے تمہاری جدائی میں کیسے کاٹے ہیں۔۔۔۔ جاؤ ہم آپ سے نہیں بولتے، کسم انداز بے نیازی سے منہ پھیرتے ہوئے بولی۔ کسم کو دلاور پیار سے "کشمش" پکارتا ہے۔ دلاور کسم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا۔ دیکھو کشمش میرا یہاں روز آنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی شہر سے باہر گیا ہوا تھا آج ہی لوٹا ہوں اور سیدھا ادھر ہی آ رہا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے جدائی کے لمحے کتنے اذیت ناک ہوتے

مجھے کون لے جائے گا۔ ماں کے پاس یہ بوڑھا کس کام آئے گا' بوڑھے نے پتہ وغیرہ کسم سے لیا اور دونوں وہاں سے چلدئے۔ گاڑی سے اترنے کے بعد وہ ٹانگے میں سوار ہو گئے۔ تانگہ ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے رکا۔ "بابا! یہ کونسی جگہ ہے۔" کسم اچانک پوچھ بیٹھی۔ "بیٹی! تیری ماں آجکل یہاں پر ہی رہتی ہے" "بابا! آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

کسم کو عجیب سا محسوس ہوا۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے میں ماں ماں پکارنے لگی۔ وہ واپس ہال کی طرف بڑھی تو اس کے کانوں سے بوڑھے شخص کے یہ الفاظ ٹکرائے۔ "اے سونا بائی۔ پوری سونے کی کان اٹھا لایا ہوں۔ تیرا بڑھاپا آرام سے کٹ جائے گا۔" کسم کے کانوں میں طبلے سارنگی اور گھونگروں کی ملی جلی آواز گونجنے لگی۔ اسے لگا جیسے وہ کسی دلدل میں پھنس گئی ہو۔ اس کے ذہن میں ماں کے وہ الفاظ گونج گئے۔ کوئی طوائف اپنی بیٹی کو دھندے پر نہیں لگاتی۔ اس کے کانوں میں طوائف ... طوائف .... طوائف کی آواز گونجنے لگی۔

دلانے والا بھی تو دلاور ہی تھا۔ وہ دلاور سے بے حد پیار کرتی تھی۔ دلاور بھی اس کی ہر خوشی کا خیال رکھتا تھا۔ دلاور ایک رائفل فیکٹری میں کام کرنے لگا تھا۔ شام کو جب وہ تھکا ماندہ گھر لوٹتا تو کسم اپنی محبت اور خدمت سے اس کی ساری تھکاوٹ دور کرتی۔ دلاور اپنی قسمت پر ناز کرتا کہ اس نے کسم جیسا ہیرا چُنا اس طرح ان کی شادی کو تیسرا سال لگنے لگا۔ ایک روز جب شام کو دلاور گھر لوٹ رہا تھا تو گلی کی نکڑ سے کسی شخص کو اس نے مکان کی کھڑکی کے قریب کسم سے باتیں کرتے دیکھا تو اسے فوراً یاد آیا کہ کل شام جب وہ گھر لوٹ رہا تھا تو اسے اندھیرے میں ایک سایہ کھڑکی کے پاس سے بھاگتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ اس وقت اس نے دھیان نہیں دیا تھا کیونکہ وہ حد سے زیادہ تھکا ہوا تھا۔ . . . اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات ابھرنے لگے اور دل میں کئی شبہات پیدا ہونے لگے۔ ضرور کوئی کوٹھے کا یار ہوگا اس کا۔ یہاں بھی پہنچ گئے سالے . . . وہ بڑبڑایا. . . .
اس کا چہرہ غصّے سے لال ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔ اتنا بڑا دھوکا۔ پیار کے نام پر فریب . . . . آخر طوائف کی بیٹی طوائف ہی نکلی، نالی کا کیڑا نالی میں اچھا لگتا ہے . . . . اچّھا تھا سالی وہیں پر رہ کر کسی کے بستر کی چادر بنتی . . . . یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ بدحواسی کے عالم میں آگے بڑھا اور پھر ایک زوردار دھماکے کی آواز فضا میں گونج گئی۔ گولی کی آواز سن کر لوگوں کی ایک بھیڑ جمع ہوگئی۔ بر وقت پولیس بھی پہنچ گئی . . . "یُو۔ آر۔ انڈر۔ ارسٹ" انسپکٹر نے دلاور کو ہتھکڑی پہناتے ہوئے کہا . . . ثبوت بھی موجود تھا . . . گواہ بھی موجود تھے۔ دلاور کو چودہ سال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی . . . . کچھ دن کسم نے لوگوں کے طعنے سن سن کر وہیں پر کاٹے . . . . ایک دن ایک ضعیف العمر پڑوسی کسم کے پاس آیا اور بولا: "بیٹی! مجھ سے تیری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ تو اپنے میکے کیوں نہیں چلی جاتی۔" یہ سنتے ہی کسم کو اُمیّد کی ایک کرن نظر آئی۔ لیکن

پتھر کے صنم

یہ گاؤں ایک بہت بڑے نالے کے ساحل والی پہاڑی پر واقع تھا۔ ساری پہاڑی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ دوسرے تمام دیہاتوں کے چھوٹے چھوٹے نالے آکر اس نالے میں ملتے تھے۔ زیادہ تر ساون کے موسم میں یہ نالہ اپنے ساتھ طغیانی میں لائے ہوئے بڑے بڑے پتّھر یہاں کے میدانوں میں پھیلا دیتا۔ اور باقی موسموں میں اس نالے کا پانی معمول کے مطابق بہتا رہتا۔ یہی پانی گاؤں کے باشندے پینے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ یہ تمام علاقہ بنجر تھا۔ نالے کے ساحل پر لوگوں نے جو تھوڑی بہت اراضی دھان کے لئے بنائی تھی وہ بھی طغیانی کی نذر ہو گئی تھی۔ نالے کی دوسری جانب پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جن پر چیل اور دیودار کے گھنّے درخت آسمان کو چھونے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ سرسبز پہاڑیوں کے پیچھے سے چند برفیلی چوٹیاں سر اٹھائے فلک سے محو گفتگو تھیں۔ نالے سے کافی دور درختوں کے ایک جھنڈ میں چھوٹا سا مندر دکھائی دے رہا تھا۔ جس کی پیشانی پر کیسری رنگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس گاؤں کا پتھر کافی مشہور تھا۔ اور گاؤں والوں نے پتّھروں کو ذریعہ ہی معاش بنا لیا تھا۔ کافی عرصہ پہلے سنگ تراشوں کے چند گھرانے اس گاؤں میں آئے تھے۔ پھر رفتہ رفتہ انہوں نے یہیں سکونت اختیار کر لی۔ اسی لئے گاؤں کا نام پتھر باگاؤں پڑ گیا تھا۔ اس گاؤں میں بہت سے پانی کے چشمے موجود تھے جن کا پانی سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں ٹھنڈا ہوتا تھا۔ اس گاؤں کی خوش نصیبی یہ تھی کہ اس گاؤں میں بڈھا امرناتھ کی متبرک

جہیز

'' رام ، رام ، رام ...... ایک مہینے پہلے بیچاری اس گھر میں دلہن بن کر آئی تھی اور آج اسی گھر سے اس کی ارتھی جا رہی ہے۔''

" ہاں ! بیچاری ..... بُرا ہو اس گیس کا جس سے وہ جل گئی۔''

'' ارے گیس کا نہیں ، ساس کا کہو ساس کا''

دست مبارک سے گوپی کو دیا۔ کئی دنوں تک گوپی نام گاؤں والوں کی زبان پر مچلتا رہا اس لئے راجہ صاحب نے گوپی سے بھگوان کرشن کی ایک مورتی بنوانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کل شام سے ہی گوپی راجہ صاحب کے آدمیوں کے ساتھ راجہ صاحب کی حویلی شانتی نگر روانہ ہو گیا تھا۔ ساری رات سفر کرنے کے بعد جب وہ حویلی پہنچے تو گوپی کو ایک کمرے میں ٹھہرا دیا۔ گوپی آرام کرنے کی غرض سے چارپائی پر نیم دراز ہو کر لیٹ گیا وہ کافی دیر تک کمرے کی چھت کو گھورتا رہا۔ جس پر عمدہ قسم کی نقش نگاری موجود تھی۔ دو چار کروٹیں بدلنے کے بعد وہ بے سدھ ہو گیا۔

راجہ صاحب منڈیر پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ گڑ۔ گڑ کی آواز فضا میں عجیب قسم کا ترنم پیدا کر رہی تھی۔ ان کی نظریں سامنے دانہ چگ رہے کبوتروں پر جمی ہوئی تھیں۔ غٹرغوں، غٹرغوں کی آواز گڑ گڑ کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر فضا میں منتشر ہو جاتی اور پھر چند لمحوں کے لئے ماحول پر ایک سکون طاری ہو جاتا راجہ صاحب نے ایک مٹھی دانہ کبوتروں کی جانب پھینکا ہی تھا کہ آداب کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ انہوں نے حقّے کی نال منہ سے باہر نکال کر دائیں جانب نظر گھمائی تو سامنے دو آدمی ایک اجنبی کو لئے کھڑے تھے۔ یہ کون ہیں؟ راجہ صاحب کی گرج دار آواز سن کر وہ سہم گئے۔ اور دونوں آدمی سر جھکائے ادب سے بولے۔

"راجہ صاحب! یہ گوپی ہے۔ پتھریا گاؤں سے اسے ہم لائے۔ ادب سے بولے۔ راجہ صاحب نے پھر حقّے کی نال منہ میں دبالی اور سانس اندر کی طرف کھینچ کر دھواں ہوا میں چھوڑتے ہوئے بولے۔ "گوپی، کون گوپی"؟ دونوں آدمی پھر ایک ساتھ بولے۔" دینا ناتھ سنگ تراش کا بیٹا۔ گوپی۔" گوپی کا دل کسی انجانے خوف سے گھبرانے لگا۔ جیسے ابھی اسے پھانسی کی سزا سنائی

گھپائیں تھیں۔ ہر سال راکھی کے تہوار پر یہاں ایک بہت بڑا میلہ لگتا جس میں دور دور سے ہزاروں کی تعداد میں یاتری گھوڑوں اور ٹٹوؤں پر یہاں درشن کرنے آتے۔ اور جاتے وقت اپنے ساتھ اس گاؤں سے بھگوان کی مورتیاں پرشاد کے طور پر لے جاتے۔ گاؤں والے اس موقعے سے خوب فائدہ اٹھاتے اور سال بھر کی کمائی کر لیتے۔ اس گاؤں کے علاوہ چار اور گاؤں بھی راجہ کی جاگیر میں شامل تھے۔ اگرچہ آزادی ملے کئی سال ہو چکے تھے۔ لیکن ابھی تک پانچ دیہاتوں پر راجہ صاحب کا دبدبہ پوری طرح مسلط تھا۔ گاؤں کے بھولے بھالے لوگ راجہ صاحب کے ایک اشاسے پر جان تک دینے کو تیار ہو جاتے۔ کیونکہ ان کی پشتیں غلامی کی زندگی بسر کرتی آئی تھیں۔ اور راجہ صاحب کی کئی پشتیں راج کرتے۔۔۔۔ پہاڑی پر پھیلی ہوئی پگڈنڈیوں میں سے ایک پگڈنڈی بچھڑ کر دینا ناتھ کی جھونپڑی کی طرف جاتی تھی۔ دینا ناتھ ایک مکمّل سنگ تراش تھا۔ سنگ تراشی کا فن اسے ورثے میں ملا تھا۔ اس کے باپ دادا یہی کام کرتے آئے تھے۔ دینا ناتھ بڑے بڑے پتھروں کو تراش کر بھگوان کا روپ بنا دیتا ہے۔ دینا ناتھ سنگ تراشی کے فن سے پوری طرح واقف تھا۔ اس نے اپنے بیٹے گوپی کو بھی اس فن سے اچھی طرح روشناس کرایا تھا۔

گوپی اپنے باپ سے بھی اچھّی مورتی تراش سکتا تھا۔ اس فن میں اسے کمال حاصل تھا۔ اس بات کا ثبوت اس نے پچھلے سال میں میلے میں ماں اور بچے کی بے مثال مورتی بنا کر دیا تھا۔ اس نے ماںتا کی صحیح عکاسّی کی تھی۔ یہ گاؤں سنگ تراشوں کا ضرور تھا لیکن آج تک کسی بھی سنگ تراش نے ایسا خوب صورت شاہکار تخلیق نہیں کیا تھا۔

راجہ صاحب جو اس میلے کے مہمان خصوصی تھے اس مورتی سے بے حد متاثر ہوئے اور اس سال کا بہترین سنگ تراش کا انعام انہوں نے اپنے

مجھے امید ہے گوپی تم بالکل ایسی ہی مورتی تراش لو گے لیکن ہماری ایک شرط .... شرط - گوپی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا - وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا - ک ..... ک ..... کیسی شرط - راجہ صاحب شرط یہ ہے کہ نقاب کشائی سے پہلے اس پر کسی کی نظر نہ پڑے - نہ ہم دیکھیں گے نہ رادھا بٹیا اور نہ ہی کوئی اور . . . . کیا میں بھی نہیں ؟ گوپی نے از سر مذاق کہا - گوپی کی بات پر راجہ ہنس پڑے اور بولے -

ارے نہیں بھئی تمہیں تو پورا اختیار ہے - تم دیکھ سکتے ہو - ویسے تم مذاق اچھا کر لیتے ہو - گوپی شرما گیا - اچھا دیکھو وہ سامنے ہمارا فارم ہاوس ہے - تم وہاں پر اپنا کام شروع کر سکتے ہو - پتھر ہم نے منگوا کر رکھے ہیں - جو مورتی بنانے کے قابل ہو - اسے چن لو - راجہ صاحب نے چلم پھونکتے ہوئے کہا -

" ٹھیک ہے راجہ صاحب " گوپی اٹھتے ہوئے بولا - اتنے میں ایک ننھی سی گڑیا پھدکتی ہوئی وہاں پہنچ گئی - اور راجہ صاحب کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے بولی - " بھیّا ہم اپنی سہیلی کے گھر جا رہے ہیں " - گوپی پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹھک گئی - " بھیّا یہ کون ہے ؟ " " رادھا یہ گوپی ہے - پتھریا گاؤں میں رہتا ہے - ہم نے اسے بھگوان کرشن کی موتی بنوانے کے لئے یہاں بلوایا ہے رادھا نے گوپی کا سر سے پاؤں تک بھرپور جائزہ لیا اور زور زور سے ہنسنے لگی - راجہ صاحب نے رادھا کو حیرت سے دیکھا اور پوچھ بیٹھے -

" آپ ہنس کیوں رہی ہیں ؟ " بھیّا یہ آدمی مورتی تراشے گا ؟ رادھا نے سوالیہ انداز میں پوچھا - دراصل رادھا نے ایسی بات گوپی کا حلیہ دیکھ کر کہی تھی چونکہ گوپی میلے سے دھوتی کُرتے میں ملبوس تھا - رادھا کی بات پر راجہ صاحب دیر تک ہنستے رہے - پھر بولے :

" رادھا یہی وہ آدمی ہے جس کو ہم نے پچھلے سال سنگ تراش کا اول انعام

سنائی جائے گی۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد راجہ صاحب پھر بولے :

" اچھا اچھا وہ گوپی جس نے پچھلے سال میلے میں بہترین سنگ تراش کا انعام حاصل کیا تھا"۔ راجہ صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ کی لکیر دیکھ کر گوپی کی جان میں جان آئی۔

"گوپی ہمارے قریب آؤ"۔ راجہ صاحب کی آواز سن کر گوپی آگے بڑھ گیا اور وہ دونوں آدمی واپس چلے گئے۔ " تم کافی بدل گئے ہو۔" راجہ صاحب دھوئیں کا مرغولہ ہوا میں چھوڑتے ہوئے بولے۔ "ج .... ج .... جی ہاں" گوپی ہچکچاتے ہوئے بولا۔ راجہ صاحب اس کی گھبراہٹ کو بھانپ گئے۔ اور گویا ہوئے..... "ہمارا مطلب ہے پچھلے سال جب تم نے انعام جیتا تھا تم بہت چھوٹے تھے۔" "جی ہاں!" گوپی نے مختصر جواب دیا۔ گوپی! ہم بھگوان کرشن کی ایک بے مثال پتھر کی مورتی بنوا کر مندر میں دینا چاہتے ہیں۔ ہو بہو ایسی" راجہ صاحب نے گوپی کی جانب ایک بہت بڑی پینٹنگ بڑھاتے ہوئے کہا۔

گوپی نے پینٹنگ دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے انبساط میں سر ہلایا۔ "گوپی! کیا تم ایسی مورتی تراش سکتے ہو؟" راجہ صاحب نے سوال کیا۔ گوپی پینٹنگ میں پوری طرح کھو گیا۔ وہ خود بھی ایک سنگ تراش تھا لیکن وہ اس پینٹنگ سے بے حد متاثر ہوا۔ پینٹنگ میں بھگوان کرشن لبوں سے بانسری لگائے کھڑے تھے۔ گوپی کے دل سے رفتہ رفتہ راجہ صاحب کا خوف نکل رہا تھا۔ وہ فوراً بول اٹھا "جی ہاں! راجہ صاحب میں ہو بہو ایسی مورتی تراشوں گا۔ لگتا ہے کسی بہت بڑے فنکار کی تخلیق ہے۔ وہ بہت خوبصورت پینٹنگ ہے"۔ پینٹنگ کی تعریف سن کر راجہ صاحب مسکرائے اور گوپی سے مخاطب ہوئے بولا: " یہ پینٹنگ ہماری رادھا بٹیا نے بنائی ہے۔ اسے ایسی پینٹنگ بنانے کا بے حد شوق ہے۔ یہ پینٹنگ اس نے شہر میں پڑھائی کے دوران بنائی تھی۔ وہ گھر میں ہی رہتی ہے۔

یہ کہہ کر راجہ صاحب حقہ کی نال ایک طرف رکھ کر صدر دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ گوپی اور رادھا نہ جانے کب تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے اگر راجہ صاحب کی آواز ان کے کانوں سے نہ ٹکراتی.....

حویلی سے تھوڑی ہی دور راجہ صاحب کا فارم ہاوس تھا۔ فارم ہاوس کے اردگرد سفیدے کے اونچے اونچے مستی میں جھومتے درخت لگے ہوئے تھے۔ ان کے زرد پتے ہوا کے جھونکوں سے شکست کھا کر زمین پر ہارے ہوئے جواری کی طرح گر پڑے۔ فارم ہاوس کے اندر داخل ہوتے ہی دائیں طرف ایک چھوٹا سا خوبصورت مچھلیوں کا تالاب بنا ہوا تھا۔ ہر شام راجہ صاحب ان مچھلیوں کو چارہ ڈالتے۔ راجہ صاحب کی عدم موجودگی میں یہ کام رادھا انجام دیتی۔ سامنے دو سفید گھوڑے کھونٹے سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کے آگے بڑے سلیقے سے گھاس کے گچھے لٹکائے ہوئے تھے۔ فارم ہاؤس کے اندر دو عدد چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ گوپی نے اوزاروں کا تھیلہ ایک طرف رکھا اور چارپائی بچھادی۔

یہ پہاڑی علاقہ تھا، سردی ہو یا گرمی آفتاب جلدی ہی اپنا منہ پہاڑوں کے دامن میں چھپالیتا۔ اندھیرا رفتہ رفتہ گہرا ہوتا جارہا تھا۔ گوپی نے لالٹین جلادی سارے کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ روشنی میں ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ چارپائی سے آرام سے بیٹھا تھا کہ کسی کی آواز پر وہ چونک پڑا۔

"ارے چھوٹی مالکن آپ۔" گوپی رادھا کو حیرت زدہ نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

"ہاں! میں..... نہ جانے رامو کہاں چلاگیا۔ سوچا تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ یہ لو کھانا۔" رادھا نے کھانے کی تھالی گوپی کی جانب بڑھادی۔ گوپی تھالی کو ایک ٹک دیکھتا رہا جس پر طرح طرح کی سبزیاں چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں اور چاول ایک طرف موجود تھے۔ پھر اچانک پوچھ بیٹھا:

"یہ کھانا میرے لئے ہے؟"

دیا تھا۔ اس کا حلیہ مت دیکھو۔ اسے مورتی تراشنے میں کمال حاصل ہے۔ یہ بے جان پتھروں میں جان ڈال دیتا ہے۔ تبھی تو مورتی بنوانے کے لئے اس کا انتخاب کیا"

"سچ بھیّا" . . . .

"ہاں رادھا۔ تمہیں اپنے بھائی پر یقین نہیں ہے۔ ہیرے کی پہچان جوہری کو ہی ہوتی ہے۔ وہ مورتی جو آپ کی خوابگاہ میں رکھی ہے، اسی کے ہاتھوں کا شاہکار ہے۔ ارے پگلی! انسان کی شخصیت کا اندازہ اس کی صورت اور لباس دیکھ کر کبھی نہیں لگانا چاہئے۔ پھر وہ بھی تو ایک انسان تھا جس نے تاج محل بنایا ہے۔ دیکھو رادھا! ہم نے گوپی سے وچن لیا ہے کہ نقاب کشائی سے پہلے کوئی بھی اس مورتی کو نہیں دیکھے گا۔ آپ اسے دیکھنے کی ضد مت کرنا۔"

"ٹھیک ہے بھیّا!"

"شاباش میری گڑیا۔ اچھا ہم کل شہر جا رہے ہیں۔ گوپی کو جو چیز ضرورت ہو رامو کے ہاتھ بھیجدینا۔"

"راجہ صاحب! میں ان کو کیا کہہ کر پکاروں۔" گوپی جواب تک خاموش بیٹھا۔ بہن بھائی کی گفتگو سن رہا تھا۔ معصومیت سے پوچھ بیٹھا۔

راجہ صاحب کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے: "تم ان کو چھوٹی مالکن کہہ سکتے ہو۔"

"نہیں بھیّا! رادھا ہی ٹھیک رہے گا۔"

"رادھا!" راجہ صاحب غصّے میں گرجے تو رادھا سہم گئی۔ پھر راجہ صاحب گوپی سے مخاطب ہوئے: "تم کل ہی کام شروع کر دو۔"

"ٹھیک ہے۔ مائی باپ۔" گوپی ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ اور اٹھ کر چلا گیا ابھی وہ برآمدے کی سیڑھیاں ہی اتر رہا تھا کہ راجہ صاحب کی آواز پر وہ واپس پلٹا۔

"گوپی! اب تم تب تک حویلی نہیں آؤ گے جب تک ہم تمہیں نہیں بلائیں"

سرحدوں کو چھوڑ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے پہاڑوں کے پیچھے منہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گوپی نے تمام اوزار سمیٹ کر تھیلے میں ڈالے اور خود گھاس کی گھاڑی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اچانک اسے پھاٹک کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ رادھا راموں کے ساتھ فارم ہاؤس کے اندر داخل ہو چکی تھی۔ وہ دونوں جا کر تالاب کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ رادھا نے ڈبے میں سے چارہ اٹھایا اور تالاب میں پھینک دیا۔ چند مچھلیاں پانی کی سطح پر تیرنے لگیں۔ پھر ایک دوسرے سے یلغار کرتے ہوئے دانے کے پیچھے دوڑتی ہوئی پانی کی تہہ تک پہنچ گئیں۔ ان کی کشمکش دیکھ کر راموں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ گوپی بھی دھیرے دھیرے تالاب کے کنارے آ کر کھڑا ہو گیا۔ رادھا نے کھنکیوں سے گوپی کو دیکھا جو پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی اکھاڑ رہا تھا۔

"چھوٹی مالکن! کیا راجہ صاحب شہر سے نہیں لوٹے؟" گوپی نے اچانک پوچھا۔

"نہیں" رادھا نے مختصر جواب دیا تو گوپی چپ ہو گیا۔

"کیا کوئی کام تھا ان سے؟" رادھا نے سوال کیا۔

"جی نہیں! یونہی پوچھ بیٹھا۔" گوپی تالاب کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

وقت صابن کی جھاگ کی طرح ہاتھوں سے نکلتا رہا۔ گوپی کو یہاں آئے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ راجہ صاحب نے مورتی کے اردگرد گھاس کی بڑی گھاڑیاں رکھوائی ہوئی تھیں تاکہ مورتی پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔ گوپی مورتی پر اچھا خاصا کام کر چکا تھا۔ اس دوران راجہ صاحب کئی مرتبہ شہر سے آئے اور چلے گئے جیسے وہ کسی خاص کام سے شہر جاتے تھے البتہ وہ کسی کو کچھ نہ بتاتے تھے انہیں اتنی فرصت ہی کہاں تھی کہ وہ گوپی سے اس کی ضروریات کے بارے میں پوچھتے۔ پھر اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ راجہ صاحب

رادھا اس کی بات سن کر پہلے مسکرائی۔ پھر بولی:

"ہاں! ہاں! تمہارے لئے۔"

"لیکن اتنی ساری سبزیاں۔"

"یہ بھی تمہارے لئے۔"

گوپی نے کھانا شروع کیا۔ اس دوران وہ کنکھیوں سے رادھا کو دیکھتا رہا۔ رادھا کبھی آسمان کی طرف دیکھتی تو کبھی مچھلیوں کے تالاب کو۔۔۔ گوپی نے ایسا کھانا اس سے قبل نہیں کھایا تھا۔ وہ بار بار اسٹیل کے پلیٹ کو غور سے دیکھتا اس نے محسوس کیا کہ کھانا واقعی کافی لذیذ ہے۔ رادھا اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہی تھی جیسے وہ گوپی کے نوالے گن رہی ہو۔۔۔

"کھانا کیسا لگا؟" کھانے کے بعد رادھا نے گوپی سے پوچھا۔

"بہت اچّھا جی۔۔۔ بہت اچّھا۔ چھوٹی مالکن! کیا روز مجھے ایسا کھانا ملے گا؟" گوپی نے معصومیت سے پوچھا۔

"ہاں! ہاں! کیوں نہیں؟ بھیّا کا حکم ہے تمہیں کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونی چاہیے۔" رادھا نے کھانے کے برتن سمیٹے اور وہاں سے چلدی۔ گوپی اسے دور تک دیکھتا رہا۔

رادھا اپنے پلنگ پر کروٹیں لے رہی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے بار بار گوپی کا معصوم چہرہ گھوم جاتا۔ اس کی بھولی بھالی باتیں ابھی تک رادھا کے کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔ مشکل سے اس کی آنکھ لگ گئی۔

گوپی پتھر پہ چھینی رکھ کر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ پتھر ریزہ ریزہ ہو کر ادھر ادھر بکھر جاتے۔ تھوڑی ہی دیر میں گوپی کے آس پاس پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈھیر کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔ دن بھر ہتھوڑے برساتے برساتے اس کے بازو بری طرح تھک گئے تھے۔ آفتاب آسمان کی آخری

کے درخت پتّوں کے لباس سے محروم ہو چکے تھے۔ درختوں کی شاخیں ہوا کے سرد جھونکوں سے ہلنے لگتیں تو یوں محسوس ہوتا کہ ٹھنڈ سے کانپ رہے ہوں۔ فارم ہاوس تک آتے والی پگڈنڈی پر نیلے گھاس کا ایک بھی تنکا موجود نہیں تھا۔ سامنے کے میدان میں بھیڑ بکریاں دل کی تسلّی کے لئے میدان کی سوکھی ہوئی گھاس پر منہ مار رہی تھی۔ دو پہاڑوں سے گڈریئے کی بانسری سے نکلتی تان جواں دلوں میں ہلچل مچارہی تھی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ رامو نے گوپی کو آگ جلا کر دی تاکہ وہ سردی سے محفوظ رہ سکے۔ جاتے وقت رامو گوپی سے کہہ کر گیا کہ وہ رات کو دیر سے لوٹے گا۔

رادھا نے رامو کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ساری حویلی چھان ماری لیکن رامو کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اسے فکر تھی کہ اگر رامو کل شہر بھیّا کے پاس نہ پہنچا تو غضب ہو جائے گا۔ چونکہ رابعہ صاحب نے شہر سے سندیش بھیجا تھا۔ اچانک رادھا کو خیال آیا کہ ہو سکتا ہے سردی سے بچنے کے لئے رامو گوپی کے پاس آگ تاپنے بیٹھ گیا ہو۔

رادھا شال لپیٹ کر فارم ہاوس کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس نے دیکھا پھاٹک کھلا ہوا ہے۔ وہ آواز لگاتی ہوئی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ آگ بجھ کر راکھ کا ڈھیر بن گئی تھی۔ رادھا کمرے میں پہنچی تو گوپی کو دیکھ کر حیران ہو گئی جو اپنی چارپائی پر گٹھری بنا ہوا سویا تھا۔ دوسری چارپائی خالی پڑی تھی۔ رادھا کو گوپی کی اس حالت پر ترس آیا۔ رادھا کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو چھلک پڑے۔ گوپی نے نیا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ رادھا نے اپنے اوپر لپٹا ہوا شال اتار کر گوپی پر ڈال دیا اور لالٹین کی روشنی مدھم کی۔ اور اس کی قدم حویلی کی طرف بڑھ گئے۔ رات دیر سے جب رامو لوٹا تو اسے کسی نے بتایا کہ چھوٹی مالکن اسے تلاش کر رہی تھیں تو وہ سہما سہما رادھا کے پاس پہنچا

کی عدم موجودگی میں یہ رادھا کی ذمّہ داری تھی۔ گوپی ایک ایسا شاہکار بنانا چاہتا تھا جسے گاؤں والے مدّتوں یاد رکھیں۔

ایک دن بعد دوپہر رادھا فارم ہاؤس آئی اور ایک لفافہ گوپی کو تھماتے ہوئے بولی۔

"یہ لو گوپی۔"

گوپی نے لفافہ کھول کر دیکھا تو چونک گیا۔ لفافہ میں کپڑوں کا ایک نیا جوڑا تھا۔۔۔۔۔

"چھوٹی مالکن! یہ کیا ہے؟" گوپی جوڑے کی طرف دیکھ کر بولا۔

"تمہارے پاس کپڑے کا صرف ایک ہی جوڑا تھا۔ اسی لئے ہم یہ کپڑے لائے ہیں۔" رادھا گھاس کا تنکا انگلی پر لپیٹتے ہوئے بولی۔

"لیکن" گوپی اس سے آگے کچھ نہ بول سکا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے جوڑے کو دیکھتا رہا۔

"دیکھو گوپی! بھیّا نے تمہاری ہر ضرورت پوری کرنے کا حکم دیا ہے اور پھر تمہاری ضروریات میں لباس بھی شامل ہے۔"

یہ سن کر گوپی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ رادھا سے مخاطب ہوا۔

"چھوٹی مالکن! آپ میرا کتنا خیال رکھتی ہیں۔ آپ کو میری کتنی فکر ہے؟"

"گوپی! بھیّا کہتے ہیں جن کے دل میں دوسروں کے لئے ہمدردی نہیں ہوتی وہ انسان کہلانے کے لائق نہیں ہوتے۔ اب جاؤ اور نہا کر کپڑے بدل لو۔"

یہ کہہ کر رادھا رامو کے ساتھ پھاٹک سے باہر نکل گئی۔ گوپی دیر تک سوچتا رہا کہ اس دنیا میں اس کا خیال رکھنے والا کوئی بھی ہے۔

سردی اپنے پورے شباب پر تھی۔ ہوا کے سرد جھونکے سردی کا احساس دلا رہے تھے۔ صبح شام سارے گاؤں میں دھند پھیل جاتی۔ فارم کے آس پاس

"چھوٹی مالکن! یہ کیا؟ آپ نے مجھ غریب کے لئے اتنا قیمتی شال پھاڑ ڈالا۔" گوپی نے شال کا کونہ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"بس کرو گوپی، بس کرو۔ مجھے بار بار چھوٹی مالکن کہہ کر مت پکارو۔"

رادھا نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لئے۔ "تم مجھے رادھا کہو، صرف رادھا۔"

"نہیں نہیں۔ میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔"

"کیوں نہیں۔ آخر میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں۔ پھر یہ امتیاز کیوں"

دراصل گوپی کو راجہ صاحب کے وہ الفاظ ابھی تک یاد تھے جب پہلے دن منڈیر پر رادھا نے کہا تھا۔ بھیّا یہ مجھے رادھا ہی کہے تو راجہ صاحب نے غصّے میں کہا تھا۔ رادھا! تم ہوش میں نہیں ہو۔

"نہیں! نہیں! چھوٹی مالکن! میں یہاں مورتی تراشنے آیا ہوں۔ مجھ غریب کو کسی سے ناطہ جوڑنے کا کوئی حق نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ راجہ صاحب آپ پر ناراض ہوں۔ اگر رامو نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا۔" گوپی پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس کے لب کانپ رہے تھے۔

"نہیں گوپی۔ رامو سویرے ہی شہر چلا گیا ہے۔ آج مت روکو مجھے۔ کہہ لینے دو مجھے۔ گوپی! جی بھر کے کہہ لینے دو۔" رادھا شدّت جذبات میں بولتی جارہی تھی۔

"سچ بتاؤ گوپی، میں تمہیں اچھی نہیں لگتی؟ تمہیں بھگوان کی قسم ہے۔ گوپی مت کہنا۔ ورنہ میں جان دیدوں گی۔"

"چھوٹی مالکن!"

"ہاں گوپی جلدی بتاؤ ..... گوپی! جو مورتی تم تراش رہے ہو تمہیں اس کی قسم ہے۔" رادھا نے گھاس کی گھاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو گوپی نے خاموشی سے سر جھکالیا۔"

"گوپی! یہ خاموشی تمہاری محبت کا اقرار ہے۔ آج میرے دل سے سارا

"چھوٹی مالکن ! آپ مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔" آواز سن کر رادھا پلٹی اور رامو پر برس پڑی۔

رامو علی الصباح شہر جانے کے لئے تیار ہوا۔

صبح جب گوپی کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے اوپر قیمتی شال دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ یہ شال کس کا ہو سکتا ہے۔ اچانک اُسے یاد آیا کہ کل شام یہ شال رادھا نے لپیٹا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا شال لے کر حویلی کی جانب بڑھا۔ حویلی کے نزدیک پہنچ کر وہ رک گیا۔ اسے راجہ صاحب کے وہ الفاظ یاد آگئے" جب تک ہم تمہیں بلائیں گے نہیں حویلی نہیں آؤ گے"۔ مجبور اور بے بس ہو کر وہ واپس پلٹا اور غصّے سے مورتی پر ہتھوڑے برسانے لگا۔ جب اس کا غصّہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے مورتی کی آنکھیں تراشنا شروع کیں۔ وہ کافی دیر تک شال کے بارے میں سوچتا رہا۔ اور زور زور سے مورتی پر ہتھوڑے برساتا رہا۔ وہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ ہاتھ پر پڑنے والے ہتھوڑوں کا اسے کچھ علم نہ تھا' اس وقت ہوش آیا جب رادھا کی آواز اس کے کانوں میں پڑی گھاس کی گھاڑی کے پیچھے سے ٹک ٹک کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی رادھا نے اندازہ لگایا کہ ضرور گوپی مورتی تراشنے میں مصروف ہے۔ گوپی آواز سن کر گھاڑی کے پیچھے سے نکلا....

"کیا ہے چھوٹی مالکن ؟"

جونہی رادھا کی نظر گوپی کے ہاتھ پر پڑی تو اس کی چیخ نکل گئی.....

"ارے گوپی ! یہ کیا ؟" رادھا نے حیرانگی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ایسے ہی معمولی سی چوٹ لگ گئی تھی۔"

رادھا نے دیکھا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی اپنا شال پھاڑ کر گوپی کے ہاتھ پر باندھ دیا۔

رادھا آکر راجہ صاحب سے بے اختیار لپٹ گئی۔ اور برا سا منہ بناتے ہوئے بولی: "جاؤ ہم آپ سے بات نہیں کرتے۔ آپ نے اتنے دن کیوں لگا دیئے؟"

راجہ صاحب رادھا کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے بولے:

"ارے پگلی! زندگی اور موت کے فیصلے اتنی جلدی تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ میں تمہارے لئے ایک خوشخبری لایا ہوں۔"

یہ سنتے ہی رادھا خوشی سے اچھل پڑی۔ "جلدی سنائیے نا بھیّا۔ کیا میرے لئے بھابی پسند کر کے آئے ہیں؟"

"ایسے نہیں بتاؤں گا۔ پہلے منہ ادھر لاؤ۔" راجہ صاحب نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

رادھا راجہ صاحب کے قریب آگئی تو راجہ صاحب نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اس کے منہ میں دیتے ہوئے کہا:

"ہم نے اپنی گڑیا کے لئے گڈا پسند کیا ہے۔" یہ سنتے ہی رادھا کو لگا جیسے کسی نے اس کے حلق میں زہر انڈیل دیا ہو۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"ارے ارے۔ تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔" راجہ صاحب نے رادھا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں بھیّا! ایسی بات نہیں ہے...."

"تو پھر کیا بات ہے؟"

"سیدھے کہو نا بھیّا۔ اب میں آپ پر بوجھ بن گئی ہوں جو آپ مجھے گھر سے نکالنے پر تلے ہوئے ہیں۔"

"ارے پگلی! ایک نہ ایک دن تو ہر لڑکی کو سسرال جانا ہی ہوتا ہے۔ پھر بیٹی تو پرایا دھن ہوتا ہے۔" راجہ صاحب کی آنکھوں سے موتی بہنے لگے۔ تو انہوں نے بات ٹالتے ہوئے کہا:

بوجھ اتر گیا۔۔۔۔۔ گوپی! تمہاری معصومیت نے نہ جانے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے جو سوتے جاگتے تمہارا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے رقص کرتا ہے۔"

گوپی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ وہ ہاتھ کی پٹی کو ٹھیک کرتے ہوئے بولا:

"مجھے راجہ صاحب سے ڈر لگتا ہے۔۔۔۔"

"گوپی! تم خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔ بھیّا بڑے نرم دل انسان ہیں۔"

بحث ختم کرنے کے بعد رادھا نے کھانے کی تھالی گوپی کو تھما دی۔ گوپی بے بس تھا۔ اس کے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر رادھا اس کے قریب آ گئی۔ اور اپنے ہاتھوں سے گوپی کو نوالے کھلانے لگی۔ گوپی کو عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ آج گوپی کو یقین آیا کہ محبّت ذات پات، امیر و غریب، رنگ و نسل کے بندھن سے آزاد ہے۔

رادھا نے گوپی سے کہا کہ وہ آرام کرے۔ "آج بھیّا شہر سے آ رہے ہیں۔ میں انہیں کہہ دونگی کہ گوپی کے ہاتھ میں چوٹ لگی ہے اس لئے وہ آرام کرنا چاہتا ہے۔"

گوپی جو کل تک دنیا کو کوئی اہمیت نہیں دیتا آج وہی دنیا اس کے لئے فردوس بن گئی تھی۔ رادھا کو پاکر گوپی کو محسوس ہوا کہ زندگی کی طویل راہ گذر پر چلنے کے لئے اسے ایک اچھّا ہمسفر مل گیا ہے۔ اس دوران رادھا اور گوپی ایک دوسرے کے کافی قریب آ گئے تھے۔ وہ گوپی کا ہر طریقے سے خیال رکھتی۔ لیکن گوپی کو ابھی بھی ڈر تھا کہ کہیں راجہ صاحب اس گستاخی کی سزا نہ دیں کیونکہ اس گاؤں کے کچھ اپنے قاعدے قانون تھے۔ ہر بات کا فیصلہ کرنے کا راجہ صاحب کو پورا اختیار تھا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ رادھا جو راجہ صاحب کی بہن ہے اس جرم میں برابر کی شریک ہے وہ مطمئن ہو جاتا۔

راجہ صاحب حویلی میں داخل ہوتے ہی رادھا رادھا چلاّنے لگے۔

کھڑا بڑے ادب سے بولا۔

"دیکھو! اگلے ہفتے جنم اشٹمی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جنم اشٹمی سے ایک دن پہلے بھگوان کرشن کی مورتی کا افتتاح کرا کے مندر میں رکھوا دیں۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟" راجہ صاحب ایک مٹھی چارہ تالاب میں پھینکتے ہوئے بولے۔

"کیوں نہیں مائی باپ ..... صفائی کا کام ہفتہ بھر میں ہو جائے گا۔"

"تو کیا ہم تیاری شروع کریں؟"

"جی حضور۔"

اور راجہ صاحب پھاٹک سے باہر نکل گئے ..... گوپی نے مورتی بڑی محنت اور لگن سے تراشی تھی۔ اسے یقین تھا کہ راجہ صاحب خوش ہو کر اسے کوئی بہت بڑا انعام دیں گے۔ وہ ریت کے محل بنانے لگا۔ اگر راجہ صاحب نے کچھ مانگنے کو کہا تو وہ رادھا کو مانگ لے گا۔

رات کے اندھیرے میں مورتی کو سفید کپڑے میں لپیٹ کر ایک کھلے میدان میں اونچی جگہ پر سجایا گیا تاکہ ہر کوئی آسانی سے دیکھ سکے۔ سویرا ہوتے ہی لوگوں کی بھیڑ میدان میں اکٹھی ہونی شروع ہو گئی۔ دوپہر تک میدان میں لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر امڈ پڑا۔ ہر آدمی کے ہاتھ میں پھولوں کی ایک ایک مالا موجود تھی جو وہ گوپی کے لئے لائے تھے۔ گاؤں کے معزز اشخاص اسٹیج پر بڑے سلیقے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ گاؤں کی پنچایت کی طرف سے گوپی کو ایک شال دینا تھا راجہ صاحب نے گاؤں والوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اس مورتی کی نقاب کشائی رادھا کرے گی۔

میدان میں کھڑا ہر شخص مورتی کا دیدار کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ لوگوں میں کچھ شور اٹھا۔ نعرے بھی لگے۔ "راجہ دلاور سنگھ جی کی جے ..... راجہ دلاور سنگھ جی کی جے۔" راجہ صاحب بیٹھ گئے۔ تو رادھا کھڑی ہو گئی اور خراماں

"ہماری گڑیا کا دلہا بہت سندر ہے۔ خاندان بھی اچھا ہے۔"

رادھا شرما کر اندر بھاگ گئی۔ . . . ادھر گوپی نے دو تین دن سے کچھ نہیں کھایا۔ کیونکہ جب سے راجہ صاحب شہر سے لوٹے تھے، رامو کھانا لے کر جاتا تو گوپی کہتا "مجھے بھوک نہیں ہے۔" رامو کھانا واپس لے جاتا تو کھانا دیکھ کر رادھا کے دل پر چھریاں چلنے لگتیں۔ ایک دن راجہ صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے تو رادھا رامو کو ڈھونڈنے کے بہانے فارم ہاؤس پہنچ گئی۔ اور گوپی کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ گوپی کا سارا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ ہونٹ خزاں کے پتوں کی مانند سوکھے ہوئے تھے۔ آنکھیں اندر کی طرف دھنسی تھیں۔ رادھا نے گوپی کے جسم کو چھوا تو چونک پڑی۔ گوپی نے آنکھیں کھولیں تو رادھا کو دیکھ کر بول اٹھا:

"چھوٹی مالکن!"

رادھا نے فوراً اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر اپنا نرم و نازک ہاتھ رکھ دیا وہ موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے رادھا کے رخساروں پر پھیل گئے۔ گوپی کے کپکپاتے ہوئے ہونٹ آپس میں ٹکرائے اور اس کے منہ سے نکلا: "رادھا" رادھا کے دل کو تسکین ہوئی۔

"رادھا! اب میں تم سے دور نہیں رہ سکتا۔ اب تم مجھے چھوڑ کر مت جانا۔ گوپی نے رادھا کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا

رادھا جو اسے کچھ کہنے آئی تھی اس کی حالت دیکھ کر نہ کہہ سکی۔

"گوپی! میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو۔" رادھا نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ کافی دیر تک گوپی کا دل بہلاتی رہی۔

راجہ صاحب مچھلیوں کو چارہ ڈالنے فارم ہاؤس آئے تو گوپی سے دریافت کیا: "کہاں تک پہنچا تمہارا کام؟"

"صفائی کا کام باقی رہ گیا ہے مائی باپ۔" گوپی تالاب کے دوسرے کنارے

"ہم نے تمہیں بھگوان کرشن کی مورتی بنانے کے لئے کہا تھا' رادھا کی مورتی بنانے کے لئے نہیں۔"

یہ سنتے ہی گوپی کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ وہ پسینے سے شرابور ہو گیا اسے ساری کائنات گھومتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ زور زور سے چلانے لگا۔

"راجہ صاحب! میں کچھ نہیں جانتا یہ سب کیسے ہو گیا۔ میں نے بھگوان کرشن کی مورتی تراشی تھی۔"

جواب میں زناٹے دار تھپڑ گوپی کے گال پر پڑا تو گوپی تڑپ اٹھا۔ رادھا بُت بنی ایک طرف خاموش کھڑی تھی۔ راجہ صاحب غصّے سے لال پیلے ہو گئے۔۔۔۔۔

"اس کی سزا تمہیں ملے گی اور ضرور ملے گی۔"

"لیکن راجہ صاحب میں بے قصور ہوں۔" گوپی کو امیّد تھی کہ رادھا آگے بڑھ کر راجہ صاحب کو سب کچھ بتا دے گی۔ وہ التجانہ لہجے میں بولا۔

"راجہ صاحب! میرا قصور کیا ہے؟"

"تمہارا قصور۔۔۔ تمہاری خطاؤں کی فہرست بہت طویل ہے۔۔۔ ایک حقیر ذرّے نے آفتاب کو چومنے کی ناکام کوشش کی ہے۔۔۔ ایک گندی نالی نے سمندر سے ٹکرانے کی جسارت کی ہے۔۔۔ تمہارے گندے ہاتھوں نے ایک پاکیزہ آنچل کو چھونے کا قصور کیا ہے۔۔۔ ایک دیوانے مالی نے کیکر کے درخت پر انگور کی بیل چڑھانے کا خواب دیکھا ہے۔۔۔ ایک بھکاری نے مخمل پر ٹاٹ کا پیوند لگانے کی جرأت کی ہے پھر بھی تم پوچھتے ہو کہ تمہارا قصور کیا ہے۔۔۔"

راجہ صاحب گاؤں والوں سے مخاطب ہوئے۔ "اس بے وقوف نے ہمارے گاؤں کی عزت کو للکارنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تم سب کا گنہگار ہے۔ اس کو اتنے پتھر مارو تاکہ اس کا حشر دیکھ کر پھر اس گاؤں کی لڑکی کو بری نظر سے دیکھنے کی

خراماں چلتی ہوئی مورتی کے قریب پہنچی۔ اس نے سب سے نظریں بچا کر کن کھیوں سے گوپی کو دیکھا۔ گوپی کے دل میں خوشی سے ایک ہلچل مچی ہوئی تھی وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ رادھا پہلی بار کسی چیز کا افتتاح کرنے جا رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

آفتاب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان پر چمک رہا تھا سردیوں میں دھوپ کسے اچھی نہ لگے گی۔ کبھی کبھی ابر کا کوئی ٹکڑا آفتاب کے آگے آجاتا تو کچھ دیر کے لئے دھوپ غائب ہو جاتی۔ جلد ہی آفتاب ابر کے ٹکڑے کو شکست دے کر اپنی فتح کا اعلان کرتا۔ رادھا نے بھگوان کا نام لیکر اپنے ہاتھ آہستہ آہستہ مورتی کی نقاب کشائی کے لئے بڑھائے اور مورتی کے آگے سے سفید رنگ کا پردہ سرکا دیا۔ لوگوں نے تالیوں سے اس کا سواگت کیا۔ دفعتاً لوگوں کے ہاتھوں سے پھولوں کی مالائیں زمین پر آ گریں اور وہ غصّے سے آگ بگولہ ہو گئے۔

وہ زور زور سے چلّانے لگے۔ "یہ کیا مذاق ہے۔ یہ کیا مذاق ہے؟"

شور سن کر راجہ صاحب کھڑے ہوئے اور زور سے گرج پڑے۔

"کیا بات ہے؟"

لوگوں کے بیچ میں سے ایک آدمی کھڑا ہو کر بولا۔

"یہ بھگوان کرشن کی مورتی نہیں ہے۔"

"تم سب کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" راجہ صاحب غصّے میں چلّائے۔ اور خود مورتی دیکھنے کے لئے آگے بڑھ گئے۔ جونہی ان کی نظر مورتی پر پڑی تو ان کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ ان کی آنکھوں سے شرارے برس رہے تھے۔ وہ ایک نظر گوپی کو دیکھتے تو دوسری نظر مورتی کو۔ راجہ صاحب زور سے چلائے

"گوپی... گوپی"

راجہ صاحب کو غصّے میں دیکھ کر گوپی سہم گیا۔

زخمی ہل

آفتاب اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ آسمان پر چمک رہا تھا اس کی بے رحم شعاعیں کسانوں کے ادھ ننگے جسموں پر نشتر کی طرح چبھ رہی تھیں ...... پسینے سے تر اجسام دھوپ کی تپش سے جل رہے تھے۔ اور آفتاب بڑی بے رحمی سے فلک پر محو تماشہ تھا۔ جیٹھ کا مہینہ ...... غضب کی گرمی ... دور دور تک ابر کا ایک بھی ٹکڑا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گندم کی فصل کٹ چکی تھی اب اگلی فصل کے لئے زمین از سر نو تیار کی جا رہی تھی۔ تمام کسان اپنے کندھوں پر ہل اٹھائے بیلوں کو ہانکتے ہوئے اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ ..... کرتار سنگھ اور رحیم نے بھی گھر کی راہ لی۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک پگڈنڈی پر وہ چلنے لگے۔ یہ پگڈنڈی آگے چل کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھی اس کی ایک شاخ دائیں جانب اور دوسری بائیں جانب مڑ جاتی ..... رحیم بائیں جانب مڑ گیا اور کرتار سنگھ نے دائیں جانب مڑتے ہوئے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ ... کرتار سنگھ کندھے پر ہل اٹھائے بیلوں کو ہانکتا ہوا اپنے مکان کے آنگن میں پہنچ گیا۔ ہل کندھے سے اتار کر اس نے دیوار پر لگے ہوئے کیل کے ساتھ لٹکا دیا۔ اور دونوں بیلوں کو کھونٹے سے باندھ کر گھاس وغیرہ ڈالی۔ اس کا جسم تھکاوٹ سے چور تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ آنگن میں

جرأت نہ کرے۔" لوگوں نے ہاتھوں میں پتھر اٹھائے۔ گوپی دوڑتا ہوا راجہ صاحب کے قدموں میں گر پڑا....

"راجہ صاحب! مجھے معاف کر دو۔ میں بے قصور ہوں، میں بے قصور ہوں"

وہ بار بار رادھا کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھتا لیکن رادھا کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ راجہ صاحب کی ایک زوردار ٹھوکر سے وہ دور جا گرا۔ وہ پھر غصے میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ وہ زور زور سے چلانے لگا

"راجہ صاحب! اگر پتّھر کی یہ بے جان مورتی خدا ہو سکتی ہے تو محبّت خدا کیوں نہیں ہو سکتی؟ میں نے رادھا سے محبّت کی ہے۔ ہاں!... ہاں... م... ح..." وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ایک پتّھر اس کے لبوں پر آ لگا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی پتّھر گوپی کے سر اور چہرے پر آ لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پتھروں کی برسات شروع ہو گئی۔ گوپی پاگلوں کی طرح چلاتا رہا... "رادھا... رادھا.... میں بے قصور ہوں۔" لوگ پتھر مارتے رہے اور کہتے رہے" یہ پاگل ہے۔ یہ پاگل ہے۔ مارو، مارو...."

تھوڑی ہی دیر میں گوپی کا سارا جسم اور چہرہ لہولہان ہو گیا اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے مورتی کے پاس پہنچا اور کپکپاتی آواز میں مورتی سے مخاطب ہوا۔

"میرا قصور کیا ہے؟ کیا قصور ہے میرا؟... یہی کہ میں نے تمہیں تراشا ہے.... تمہیں تراشنے کا یہی انعام ہے۔ بولو.... بولو.... تم بولتی کیوں نہیں"

وہ زور زور سے مورتی سے سر ٹکرانے لگا۔ دفعتاً وہ رُک گیا.... "تم کیسے بول سکتی ہو؟... تم تو پتھر کی ہو پتھر کی... اور پتھر کبھی بولتے نہیں۔ تم گوشت پوست کے انسان کی قدر کیا جانو... تم میرے صنم کبھی نہیں ہو سکتے... تم تو پتّھر کے صنم ہو، پتّھر کے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا مورتی کے قدموں پر گر پڑا۔ مورتی کے پاؤں خون سے لت پت تھے۔ گوپی بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔

قائم کر رکھی تھی۔ گاؤں کا ہر بزرگ کہتا "خدا اس گاؤں کو دشمنوں کی نظر بد سے بچائے۔" کرتار کے دادا پر دادا ازل سے کھیتی باڑی ہی کرتے آئے تھے۔ کئی بار انہیں زیادہ فصل پیدا کرنے پر حکومت پنجاب کی طرف سے انعام بھی ملے تھے۔ اس نے بھی اس روایت کو قائم رکھا اور ہل پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ وہ چاہتا تو ٹریکٹر خرید سکتا تھا لیکن اسے باپ کے وہ الفاظ یاد تھے کہ پُتر جو برکت ہل میں ہے وہ ٹریکٹر میں کہاں۔ ٹریکٹر سے انسان آلسی ہو جاتا ہے جب تک فصل کو اپنے خون سے نہ سینچا جائے، اناج کھانے کا مزا نہیں آتا اس کے دادا کے پاس بے حساب زمین تھی لیکن خاندانی تقسیم کے بعد یہ زمین بہت کم رہ گئی تھی۔ اوپر سے سرکار نے نیا قانون بنا دیا کہ سب کے پاس برابر زمین رہے گی اور پھر چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔ اور اب کرتار کے پاس صرف دس بھیگے زمین رہ گئی تھی۔ کرتار سنگھ کی عمر تقریباً پچاس برس تھی لیکن ابھی بھی وہ بالکل تندرست نظر آ رہا تھا کیوں نہ ہوتا، پنجاب کا دودھ، دہی اور مکھن اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا تھا۔ اس کی دو اولادیں تھیں، گورچرن اور ہرچرن۔ گورچرن کو بن مانگے ہی واہے گرو نے دے دیا تھا لیکن ہرچرن کے لئے انہیں کئی بار ہرمندر صاحب ارداس کرانے جانا پڑا۔ تب جاکر وہ دنیا میں آیا....

ایک بار کرتار نے زمین بٹائی پر دے دی تھی لیکن فصل کٹنے پر اسے احساس ہوا کہ اس نے زمین بٹائی پر دے کر بہت بڑی غلطی کی۔ اسے آدھی ہی فصل پر قناعت کرنی پڑتی تھی لیکن وہ کیا کرتا۔ یہ تب کی بات ہے جب چین نے دوست بن کر اس کے وطن کی پیٹھ میں دشمنی کا خنجر گھونپ دیا اور اچانک چین نے اس کے دیش پر جنگ مسلّط کر دی تھی وہ اس وقت چالیس کے قریب تھا۔ اس میں وطن پر مر مٹنے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں اندر سے اس کی بیوی 'ویر کور' ... پنکھا لے کر آئی اور چارپائی پر بیٹھ گئی ..... " آج تو قیامت کی گرمی ہے۔ آپ کا سارا کرتہ پسینے سے بھیگ گیا ہے۔ اسے بدل ڈالو۔" ویر کور پنکھا کرتے ہوئے بولی۔

" یہ پسینہ نہیں، ہم کسانوں کا لہو ہے۔ کسان کا یہ پسینہ اگر عوام یا سرکار دیکھ لے تو اناج انمول ہو جائے۔ مگر ہم غریب کسانوں کو پوچھتا کون ہے ہر پارٹی یہ دعوٰی کرتی ہے کہ الیکشن جیتنے کے بعد کسانوں کے قرضے معاف کر دئے جائیں گے۔ کھاد اور بیج انہیں رعایتی داموں پر ملیں گے لیکن جب برسر اقتدار آتی ہے تو اپنے تمام وعدے بھول جاتی ہے۔ کبھی شیئر سکنڈل کے معاملے میں الجھ جاتی ہے تو کبھی مندر مسجد کے جھگڑے میں۔" اس طرح حکومت بنتی بھی ہے اور گر بھی جاتی ہے لیکن ہم کسان لوگ وہیں کے وہیں رہ جاتے ہیں۔ اس بات پر کوئی دھیان نہیں دیتا کہ کسانوں کو کتنی مشکلات درپیش ہیں، کتنی محنت اور مشقت کے بعد اناج پیدا کر کے دیش کے کروڑوں لوگوں کو پالتا ہے لیکن جب فصل تیار ہو جاتی ہے تو زمیندار الگ منہ کھول کر بیٹھا ہوتا ہے اور سرکار دوسری طرف۔ اناج منڈی میں پہنچتے ہی دام گر جاتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کیا بنے گا اس دیش کا اور اس سرکار کا۔" کرتار نے اپنے سر سے پٹکا کھولتے ہوئے کہا۔ اس کے کیش بھی پوری طرح پسینے سے بھیگ چکے تھے۔ وہ انہیں پنکھے سے سکھا رہا تھا۔

کرتار سنگھ مہنت بچتونگر کا رہنے والا تھا۔ یہ پنجاب کا سب سے بڑا گاؤں تھا۔ ہر طرف گنے، باجرا اور دھان کے لہلہاتے کھیت اپنی خوشحالی کا اظہار کر رہے تھے۔ بیساکھی ہو یا عید، دیوالی ہو یا دسہرہ، گدوں اور بھنگڑوں سے یہ گاؤں گونج اٹھتا تھا۔ یہاں کے لوگوں نے امن اور بھائی چارہ کی مثال

الفاظ سن کر اس نے اپنے سینے پر پتھر رکھ لیا اور پھر کرتار بھی گھر میں راشن پانی چھوڑ کر وطن کی خدمت کرنے کے لئے گھر سے نکلنے ہی لگا تھا کہ چھ سالہ ہرچرن اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور توتلی زبان میں بولا: "پھا پا جی تسیں کتھے جا رہے ہو؟" "پتر میں وطن کی خدمت کرنے کے لئے محاذ پر جا رہا ہوں۔" "میں وی تسیں نال جاواں گا۔" معصوم بچّے کی باتیں سن کر کرتار کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ کرتار نے بچّے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور بولا تمہیں واہے گورو سلامت رکھے۔ ابھی تیرا بھائی محاذ پر موجود ہے اور میں ابھی باقی ہوں۔ جب وطن کو تیری ضرورت پڑے گی تو تجھے بھی محاذ پر جانا پڑے گا۔ تو اپنی ماتا کا خیال رکھ اور وقت کا انتظار کر۔ واہے گورو نے چاہا تو فتح ہمارے ملک کی ہوگی۔ باپ کی باتیں سن کر وہ مطمئن ہو گیا۔ "اچّھا پھا پا جی! تسیں جاو میں واہے گورو سے ارداس کروں گا۔" پھر کرتار امجم کے ساتھ دیش کی خدمت کرنے نکل گیا۔ وہ دونوں اسلحہ ڈپوؤں سے اسلحہ ڈھو کر مورچوں پر پہنچانے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے کندھے لہولہان ہو گئے لیکن ان کے دلوں میں حبّ الوطنی کا جذبہ موجیں مار رہا تھا۔ کئی دنوں تک وہ فوج کی مدد کرتے رہے۔ تب تک وہ گھر نہیں آئے جب تک دیش کے محافظوں نے دشمن کو شکست نہ دے دی وہ دونوں خوشی خوشی گھر لوٹے۔ گھر پہنچ کر کرتار نے اپنی پیٹھ اور کندھوں پر دوا وغیرہ لگائی۔ وہ بے حد خوش تھا کہ وہ دیش کے کسی کام آسکا لیکن اسے کیا پتہ تھا کہ یہ خوشی پل دو پل کی مہمان ہے۔ شام نے یونٹ والوں نے اسے اطلاع دی کہ اس کا گورچرن لڑائی میں دیش کے کام آگیا۔ یہ سنتے ہی ویر کور غم سے نڈھال ہو گئی۔ اس نے اپنے سر کے بال نوچ ڈالے، چھاتی پیٹنی شروع کی۔ وہ خون کے آنسو رونے لگی۔ گھر میں لوگوں کا ہجوم امڈ پڑا۔ رحیم نے کرتار کو سہارا دیا۔ پھر وہ دونوں

اس کے باپ نے تحریک آزادی میں حصّہ لیا تھا جب وہ کرتار کو جلیاں والے باغ کا واقعہ سناتا تو اس کا خون کھول اٹھتا۔ اس کے بعد وہ کئی بار جیل بھی گیا تھا اور پھر اس نے لال قلعے پر ترنگا لہراتے بھی دیکھا تھا اس کے بعد سنتالیس کا بٹوارہ بھی اس کی گنہگار آنکھوں نے دیکھا۔ جب انگریزوں نے بھارت ماں کی چادر کے دو ٹکڑے کر دئے اور قتل و غارت شروع ہوگئی لیکن اس وقت بھی وہ اور کریم اسی گاؤں میں پیار و محبّت سے رہے۔ ایک طرف لوگوں کے دلوں میں نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی تو دوسری طرف اس گاؤں کے لوگوں کے دلوں میں محبّت کا چناب ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ کرتار کو اپنے باپ کی ایک ایک بات یاد تھی۔ پھر اسے خطرے کی گھنٹی سنائی دے رہی تھی۔ اس لئے وہ چاہتا تھا اس دیش کے مزید ٹکڑے نہ ہوں پھر اس نے اپنے بڑے بیٹے گورچرن کو اسی دن کے لئے فوج میں بھرتی کروا دیا تھا۔ اس کے دادا کی نصیحت تھی کہ ایک بیٹا فوج میں ضرور ہونا چاہئے۔ کرتار کا چاچا اور بڑا بھائی فوج میں رہ کر وطن کی خدمت کر چکے تھے۔ اس نے روایت کو بھی قائم رکھا۔ گورچرن کو ابھی تین سال ہوئے تھے کہ وطن پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔ اس وقت گورچرن دو ماہ کی چھٹی لے کر گھر آیا ہوا تھا جب کرتار نے سنا کہ سرحد پر دشمن نے حملہ کیا ہے تو اس نے فوراً بیٹے کو واپس جانے کے لئے کہا کہ پُتر اس وقت وطن کو تیری ضرورت ہے تیرا مقصد صرف تنخواہ لینا ہی نہیں بلکہ اپنے وطن کی حفاظت کرنا ہے۔ جا پُتر تیرا فرض تجھے بلا رہا ہے گورچرن روتی بلکتی ماں کو چھوڑ کر محاذ پر چلا گیا۔ کرتار نے ویر کور کو سمجھایا کہ والدین نے تیرا نام ویر کور اسی لئے رکھا ہے تیرا بیٹا بھی ویر بنے گا۔ تیرے آنسو اس کے حوصلے پست کر دیں گے۔ تمہیں اپنے دودھ پر فخر ہونا چاہئے کہ تو نے ایک بہادر سپاہی کو جنم دیا ہے۔ ایک باپ کے منہ سے ایسے

چاہے گا اولاد دے دے گا۔ اس میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اچھا آپ ہاتھ دھوکر کھانا کھالو۔ ویر کور نے مکّی کی روٹی اچار اور لسّی گلاس چارپائی پر رکھتے ہوئے کہا اور کرتار کھانا کھانے میں مصروف ہوگیا۔ ہرچرن اور اس کی بیوی "جیٹی" خوشی خوشی گھر میں داخل ہوئے۔ جیٹی کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر ویر کور خوش ہوئی۔

"آج میرا پُتر بڑا خوش ہے۔ کیوں کی گل ہے؟"

"ماتا جی! آج میں بڑی خوش ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے جلدی ہی میں...."

وہ شرما کے اندر بھاگ گئی..... ویر کور نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف جوڑتے ہوئے کہا: "واہے گورو تیرا لکھ لکھ شکر ہے کہ تو نے اس بچّی کی خوشیاں لوٹا دیں وہ دوڑتے دوڑتے کرتار کے پاس پہنچ گئی...... سنیا جی! ڈاکٹر نے کہا ہے کہ جلدی ہی ہرچرن باپ بن جائے گا۔ اچھّا! دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ واہے گورو مہر کرنے والا ہے۔ اتنے میں ہرچرن بھی آگیا۔

"پھاپا جی! میں کاغذ پتر دفتر میں جمع کرا کے آیا ہوں۔ جلد ہی اجازت مل جائے گی"

"اچھّا! اے تے بڑی خوشی دی گل ہے۔ پُتر اب تو کھانا وغیرہ کھا لے پھر ٹیوب ویل کی موٹر چالو کردے۔"

"اچھّا پھاپا جی! میں ابھی جاتا ہوں" کہہ کر ہرچرن کپڑے تبدیل کرنے کمرے میں چلا گیا۔ پولٹری فارم کے لئے جس زمین کی ضرورت تھی وہ سڑک کے کنارے والی زمین رحیم چاچا کی تھی۔ اس نے خوشی خوشی زمین کرتار کو دیدی تھی۔ اس کا بیٹا "احسان" اس فارم میں برابر شریک تھا۔ دونوں مل جل کر کام کرنے لگے۔ جیٹی کا پاؤں بھاری تھا۔ وہ بھی وقت ملنے پر فارم میں دیکھ بال کرتی۔ ویر کور بھی چاہتی تھی کہ جیٹی ایسی حالت میں خوش رہے۔ اب اس کا

سپاہیوں کے ساتھ سرحد پہنچ گئے۔ کرتار صرف یہ دیکھنے گیا تھا کہ اس کے گورچرن نے گولی پیٹھ پر کھائی ہے۔ یا چھاتی پر دیکھ کر اسے فخر ہوا کہ دیش کے بہادر سپوت نے گولی سینے پر کھائی ہے۔ انتم سنسکار کے بعد رحیم نے اس کی ہمت بندھائی پھر کرتار سنگھ نے ویر کور کو سمجھایا کہ تو اس بہادر سپاہی کی ماں ہے جس نے میدان جنگ میں چھاتی پر گولی کھا کر وطن کو فتح دلائی ہے لیکن ماں تو ماں ہوتی ہے۔ سوائے آنسو بہانے کے کچھ نہ کر سکی۔ رفتہ رفتہ یہ زخم مندمل ہونے لگا۔ اب ہرچرن ان کے لئے سب کچھ تھا۔ اس وقت کرتار نے باعث مجبوری زمین بٹائی پر دی تھی حالانکہ رحیم نے کہا بھی تھا کہ تم خود کوشش کرو ہم سب تمہاری مدد کریں گے لیکن اتنا بڑا حادثہ ہونے کے بعد اس کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ لیکن آج اس کا ہرچرن چھ فٹ کا خوبصورت جوان تھا۔ پھر وہ کیوں بٹائی پر دیتا زمین . . . وہ ہر وقت باپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتا رہتا۔ کرتار نے کُرتہ تبدیل کر کے ویر کور سے لسّی کی فرمائش کی۔ ویر کور لسّی سے بھرا برتن اور گلاس لے کر اس کے پاس رکھ گئی کرتار نے دو گلاس لسّی پی تو اس کے جگر میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ ہرچرن شہر سے واپس نہیں آیا۔ کرتار نے خالی گلاس چارپائی پر رکھتے ہوئے پوچھا آتا ہی ہوگا۔ اس پر پولٹری فارم کا بھوت سوار ہے۔ وہ سارا کام ختم کر کے ہی آئے گا۔ ویر کور نے آنگن میں جھاڑو لگاتے ہوئے جواب دیا۔ مگر بہو کو کیوں جانے دیا اس کڑکتی دھوپ میں ہرچرن کے ساتھ؟ . . . . اس نے ڈاکٹر سے چیک اپ کرانا تھا۔ اسی بہانے شہر کا چکّر بھی لگا کر آئے گی۔ جاتی ہی کہاں ہے بیچاری‘ اس کا دل بھی بہل جائے گا۔ کیوں؟ یہاں کیا وہ دُکھی تھی؟ تُسیں سمجھدے کیوں نہیں۔ اولاد نہ ہونے کا دُکھ اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ اپنا وقت بھول گئے کیا! ہرچرن کے لئے کہاں کہاں سر جھکایا۔" ارے ویرو! اپنا گورو بڑا بے پرواہ ہے وہ جب

جھپکتے ہی پانچ سال گزر گئے۔ اب کرتار نے پوتے کا نام کرن بھی کیا۔ اس کا نام "امن دیپ" سنگھ رکھا گیا یعنی پنجاب کے "امن کا چراغ"۔ گھر میں سبھی اُسے امن ہی کہتے۔ جب بھی کرتار کھیتوں میں ہل چلانے جانے لگتا تو امن بھی ننگے پاؤں آگے آگے بھاگ جاتا اور کرتار سے پہلے ہی کھیتوں میں پہنچ جاتا۔ کرتار کے بیل باندھتے ہی امن ضد کرتا کہ وہ بھی ہل چلائے گا۔ امن کی خواہش کو مدِنظر رکھتے ہوئے کرتار نے بڑھئی سے ایک چھوٹا سا کھلونا نما ہل بنوایا۔ کئی بار امن کرتار سے کہتا کہ داداجی آپ بیل بن جائیے۔ میں اپنا ہل آپ پر رکھ کر چلاؤں گا۔ ایک دن کرتار کھیتوں میں ہل جوت رہا تھا، امن بھی ساتھ ساتھ چھڑی سے بیل ہانک رہا تھا کہ اچانک "امن" رک گیا۔ اسے مٹی میں سے کوئی عجیب سی چیز مل گئی۔ اس نے یہ پہلی بار دیکھی تھی۔ جب کرتار منو کے درخت کی چھاؤں تلے بیل باندھ کر آرام کرنے لگا تو امن نے کرتار کو وہ چیز دکھاتے ہوئے پوچھا: "داداجی! یہ کیا چیز ہے؟" "کہاں؟ دادا نے پسینہ پونچھتے ہوئے پوچھا۔" "یہ میرے ہاتھ میں۔" جونہی کرتار کی نظر امن کی ہتھیلی پر پڑی تو وہ چونک پڑا۔ "تو یہ کہاں سے لایا؟" وہ حیران کن نگاہوں سے امن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا: "داداجی جب آپ ہل چلا رہے تھے، اس وقت مٹی میں سے ملی تھی۔" "لا پتر یہ مجھے دیدو" "نہیں داداجی میں اس سے کھیلوں گا۔۔۔" "نہیں پتر نہیں۔ تیرے واسطے میں نے نیا ہل جو بنوایا ہے تو اس سے کھیلنا" "نہیں داداجی اب میں اس سے نہیں کھیلوں گا۔" کیا؟ امن کی باتیں سن کر کرتار کی کھوپڑی گھوم گئی۔ اس کے ارمانوں کا محل چُور چُور ہو گیا۔ وہ امن کو سمجھانے لگا۔ "دیکھ پتر، ضد مت کر، یہ تیرے کھیلنے کی چیز نہیں ہے۔" "کیوں نہیں ہے؟" کرتار سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دے، امن ایک سوال کر بیٹھا۔ "داداجی! اس کو کیا کہتے ہیں؟" "امن پتر اس کو گولی

آخری مہینہ تھا۔ ساس اسے ذرا بھی کام نہیں کرنے دیتی تھی۔ پولٹری کا
کام چل نکلا تھا۔ رحیم چاچا بہت خوش تھا کہ وہ اپنے دوست کے کسی کام
آسکا۔ انہیں اپنی دوستی پر فخر تھا۔ وہ دونوں بچپن سے اکٹھے پلے بڑے
جوان ہوئے۔ اور اب پیری میں داخل ہو چکے تھے۔ فصل کٹائی کا موسم سر
پر آگیا تھا۔ گاؤں کے سبھی کسان کھیتی باڑی میں بے حد مصروف تھے۔ پہلے
رحیم چاچا کے آدمیوں نے کرتار کی فصل کاٹنے میں مدد کی۔ پھر کرتار کے
آدمیوں نے رحیم کا ہاتھ بٹایا۔ رحیم چاچا، ہرچرن اور کرتار سبھی آنگن میں
بچھی چارپائی پر بیٹھے بے چینی سے آنے والی گھڑی کا انتظار کر رہے تھے۔
کہ اتنے میں دائی ماں نے برآمدے میں کھلنے والے دروازے سے آواز لگائی
"بھاپا جی! مبارک ہو۔ بہو کو لڑکا ہوا ہے۔" کرتار کا منہ خوشی سے کھلا رہ گیا۔
اپنے واہے گورو سچے بادشاہ تیرا لکھ لکھ شکر ہے کہ تو نے میرے چرن کے صحن میں
پودا لگایا۔ سب سے پہلے اس نے ہرچرن کو گلے سے لگایا۔ پھر احسان اور رحیم سے
ملا۔ وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔ کئی دنوں تک آنگن میں بھنگڑے وگدّے چلتے رہے
کرتار نے مٹھائیاں بانٹیں۔ روپے لٹائے۔ اس کے گھر میں خوشیاں بھادوں
کی برسات کی طرح برس پڑیں۔ یہ سال اس کے لئے بڑا اہم ثابت ہوا تھا۔
اسی سال میں اس نے پولٹری فارم کھولا۔ فصل بھی اس سال پہلے سے دوگنی
ہوئی اور اب بیٹے کے گھر اولاد اس کا پوتا جو اس دیش کا مستقبل بننے والا تھا۔
رفتہ رفتہ دن گزرتے گئے۔ دھرتی پر ہل چلتے رہے۔ بیج اگتے رہے فصلیں
کٹتی رہیں۔ کرتار دن بھر پوتے کو اٹھا کر کھیتوں کے چکر لگاتا۔ وہ بہت خوش
تھا۔ کیوں نہ ہوتا۔ سات سال کے بعد اس کے گھر میں پوتا ہوا تھا۔ وہ اپنے
دادا کے ساتھ اتنا گھل مل گیا تھا کہ دودھ پینے کے لئے بھی نہیں روتا۔
گھڑی کی سوئیاں محوِ گردش تھیں۔ وقت کسی کے لئے نہیں رُکتا۔ پلک

موسم تھا۔ آگے آگے دونوں بیل مستانی چال چل رہے تھے۔ اور پیچھے کرتار ہل اٹھائے بھاری قدموں سے چلتا ہوا گھر کی طرف رواں تھا۔ راستے میں اس نے ہل نیچے رکھ کر ٹیوب ویل سے پانی پیا اور تھوڑی دیر سستانے کے لئے چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ دونوں بیل آس پاس بچی کھچی گھاس پر منہ مارنے لگے۔ پاس کے کھڈے سے پانی پینے کے بعد وہ ایک دوسرے کو چاٹنے لگے۔ گویا اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کر رہے ہوں۔ ان کی محبت دیکھ کر کرتار اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا۔ ایک دو کسان اس کے پاس سے گزر گئے۔ تو وہ بھی اٹھ کر ہوا۔ سکول میں آدھی چھٹی کی گھنٹی بجی تو سارے بچے شور مچاتے ہوئے میدان میں نکل آئے۔ امن ایک درخت کی گھنی چھاؤں تلے بیٹھ کر بیگ سے ڈبہ نکال کر کھانا کھانے لگا۔ پرانٹھا اور اچار وہ چٹخارے لے لے کر کھانے لگا۔ سبھی بچے اپنا اپنا کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر رنجیت امن کے پاس پہنچا۔

"امن! سکول کیسا لگا؟"

"یہاں میرا دل نہیں لگتا۔"

"دیکھو! تو روز میرے پاس بیٹھا کر۔ آہستہ آہستہ خود دل لگ جائے گا"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ رنجیت میرے پاس ایک چیز ہے۔"

"کیا چیز ہے؟"

"تو دیکھے گا۔"

"ہاں ہاں جلدی دکھانا۔ بعد میں چھٹی بند ہو جائے گی۔"

امن نے آہستہ آہستہ بیگ میں سے گولی نکال کر رنجیت کو دکھاتے ہوئے کہا: "تمہیں پتہ ہے یہ کیا ہے؟"

"نہیں"

"میں تو بتاتا ہوں یہ کیا ہے؟ اسے گولی کہتے ہیں۔ گولی' ہاں ہاں گولی

کہتے ہیں - گولی پتر۔

"دادا جی یہ گولی کیا ہوتی ہے؟"

"پتر! یہ گولی بڑی ظالم چیز ہوتی ہے - یہ انسان سے انسان کو جُدا کرتی ہے یہ انسان کی دشمن ہے۔"

"کیوں دادا جی! یہ کمبخت شاید اسی لئے بنی ہے دادا جی۔" یہ چلاّتے لگا کرتار اس کی ضد کے آگے ہار گیا - اس نے سوچا بچّہ ہے ضد کر رہا ہے - گھر چل کر وہ خود پھینک دے گا - کرتار نے کندھے پر ہل اٹھایا اور چھڑی سے بیل ہانکتا ہوا امن کو ساتھ لیکر گھر کی طرف چل پڑا - امن سیدھا دادی کی گود میں بیٹھ گیا - "دادی جی! میرے پاس کیا ہے؟"

"ارے کمبخت! تو یہ کہاں سے لایا؟"

"کیوں؟ ہل جوتتے وقت مٹی میں سے ملی ہے - میں نے اسے کہا پھینک دے لیکن یہ ہے کہ مانتا ہی نہیں۔" کرتار نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں - بچّہ ہے کھیل کر خود ہی پھینک دے گا - اچھّا وہ احسان میاں آئے تھے - کہہ رہے تھے کہ امن کا نام سکول میں درج ہو گیا ہے - کل سے اسے سکول جانا ہے - کتابیں اور بیگ وغیرہ ہرچرن آتے وقت بازار سے لے آئے گا۔"

"دن بھر کھیتوں میں گھومتا رہتا ہے - چلو اچھا ہے - سکول جاکر مصروف ہو جائے گا - آفتاب اپنی تابناک کرنوں سے ساری کائنات کو منوّر کر رہا تھا کرتار نے مویشیوں کو چارہ وغیرہ ڈالا - اور خود نہاری کر کے ہل بیل لیکر کھیتوں میں چلا گیا - احسان ان کو لیکر سکول چلا گیا - ہرچرن پولٹری میں مصروف تھا - جیتی مکی کی گرم گرم روٹیاں بنا رہی تھی - ویر کور لسی پر سے مکھن اتار رہی تھی، گذشتہ دنوں کی بارش سے گرمی میں کچھ کمی ہو گئی تھی - بیج اگانے کا بڑا اچھّا

مار رہا تھا۔ اس نے تھالی میں مکّی کی روٹی پروس کر لسّی کے گلاس کے ساتھ امن کے آگے رکھ دی۔ اس نے کھانا شروع کر دیا۔ ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ چرند پرند اپنے اپنے گھونسلوں میں پناہ لینے لگے تھے۔ کرتار نے رحیم کو آگے تک چھوڑا اور خود خراماں پگڈنڈی پر چلتا ہوا گھر پہنچا۔ اس نے صبح حکیم صاحب سے ملنے شہر جانا تھا۔ اس نے جنّی سے کہا:

"اگر بازار سے کچھ سودا سلف لانا ہے تو لکھ کر دے۔ زبانی مجھے یاد نہیں رہتا۔" بہو نے کہا:

"ابھی میرے پاس کاغذ نہیں ہے۔ آپ کہیں سے کاغذ لیکر آئیں" اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ وہ لالٹین لیکر آہستہ آہستہ امن کے سکول بیگ کے پاس پہنچا بیگ سے کاپی نکال کر وہ بہو کے پاس پہنچا۔ "بہو! لکھ دے اس پر سامان کی فہرست لیکر اس نے جیب میں رکھ لی اور کاپی واپس بیگ میں رکھنے لگا کہ اچانک اس کی نظر بیگ میں رکھی ہوئی گولی پر پڑی۔ وہ گولی لے کر ویرکور کے پاس گیا۔ یہ دیکھ اس امن دیپ نے یہ گولی اپنے سکول کے بیگ میں رکھی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں یہ کمبخت کیا کرنے والا ہے۔ صبح میں اس کی وہ پٹائی کروں گا کہ یاد کرے گا۔ جنّی' امن کی ماں جو سامنے کے کمرے میں سب کچھ سن رہی تھی۔ اس کے دل میں ممتا جاگ اٹھی۔ اور بول پڑی کیا ہو گیا۔ اگر اس نے بیگ میں گولی رکھ لی۔ بچّہ ہی تو ہے' ایک دو دن کھیل کر خود پھینک دے گا۔ ارے بہو! آج ایک مہینے سے یہ گولی اس کے پاس ہے۔ اب تک نہیں پھینکی تو پھر کب پھینکے گا۔ آج گولی لیکر گھومتا ہے۔ کل پستول لیکر گھومے گا' پرسوں بندوق لیکر۔ پھر پتہ نہیں کیا کیا کرے گا۔ بھاپا جی آپ خواہ مخواہ اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ارے بہو! میں کوئی اس کا دشمن تھوڑا ہی ہوں۔ میں کہتا ہوں اس کی عادتیں

یہ بندوق میں چلتی ہے۔"

"کیا تمہارے پاس نہیں ہے؟ وہ سکھا ہے نہ اس کے پاپا کے پاس ہے"۔

"سکھا کہاں ہے؟؟

"وہ ٹینکی کے پاس۔"

"جا اسے بلا کر لا۔" رنجیت سکھے کو بلانے کے لئے چلا گیا۔ راستے میں اسے جو بھی ملتا گیا وہ اسے بتاتا گیا کہ امن دیپ کے پاس گولی ہے۔ یہ سننا تھا کہ سبھی بچّے دوڑتے ہوئے امن کے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ "مجھے بھی دکھاو مجھے بھی دکھاو۔" امن انہیں گولی کی خاصیتیں سمجھانے لگا۔ آخر کار امن نے سکھے سے پوچھا:

"سکھے تیرے پاپا کے پاس بندوق ہے۔"

"آہو میرے پاپا شکاری ہیں۔ انادے کول بندوق وی ہے نے گولی وی۔"

"اچّھا تو مجھے اپنے گھر لے چلے گا؟"

"میرے پاپا شکار پہ گئے ہیں۔ جب وہ واپس آئیں گے تب میں تمہیں لے چلوں گا۔" اتنے میں سکول کی گھنٹی بج گئی۔ سارے بچّے اپنی اپنی کلاسوں میں چلے گئے۔ امن بھی گولی اپنے بیگ میں رکھ کر اپنی کلاس میں چلا گیا۔ امن سکول سے آکر گھر میں داخل ہوا۔ تو دادی نے بڑھ کر سینے سے لگا لیا:

"میرا پتر آ گیا سکول سے پڑھ کے۔ پتر سکول کیسا لگا۔۔۔۔"

"دادی مجھے سخت بھوک لگی ہے۔"

"اچّھا ابھی کھانا دیتی ہوں۔"

ویر کور نے جٹی کو آواز دی۔ جٹی نے آتے ہی امن کو چومنا شروع کیا اور دیر تک چھاتی سے لگا کر رکھا۔ اس کے سینے میں ممتا کا سمندر ٹھاٹھیں

"اچھا اچھا! تم بندوق چلانا سیکھنا چاہتے ہو۔" جندا بڑا شاطر انسان تھا۔ وہ ایک دم سمجھ گیا کہ اس بچّے کا ذہن کس طرف جا رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ مستقبل میں اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس نے امن کو بندوق دکھاتے ہوئے کہا:

"بیٹا! اس میں یہ گولی نہیں چلتی۔ اس میں کارتوس چلتا ہے۔ جس میں یہ گولی چلتی ہے وہ بندوق شہر میں رکھی ہوئی ہے۔ تجھے میں شہر میں وہ بندوق دکھاؤں گا۔ تو شکاری بنے گا نا؟"

"ہاں چاچا میں شکاری بنوں گا۔"

پھر امن وہاں سے نکل آیا۔ دادا نے اسے دیر سے گھر آنے کی وجہ پوچھی تو امن نے بڑے فخر سے کہا:

"دادا جی! میں سکھے کے گھر گیا تھا۔"

"سُکھا، کون سُکھا؟"

"وہ اپنے جندے چاچا کا بیٹا سُکھا۔"

یہ سن کر کرتار سنگھ کا ماتھا ٹھنکا۔ "تو وہاں کیا کرنے گیا تھا؟"

"میں اس کے باپو کی بندوق دیکھنے گیا تھا۔"

"خبردار! جو آج کے بعد وہاں قدم رکھا۔" کرتار گرج پڑا۔

"کیوں دادا جی؟ وہ تو میرا دوست ہے۔"

"ارے امن پتر۔ جندا اچھا آدمی نہیں ہے۔ شاباش میرے پتر، آئندہ وہاں نہیں جانا اچھا۔"

"اچھا دادا جی۔" امن ناگواری سے بولا۔

شام کو سب چٹائی پر بیٹھ کر کھا رہے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر امن کی بات چل پڑی۔ کرتار سنگھ نے ہرچرن سے کہا:

بگڑتی جائیں گی۔ کوئی عادت وادت نہیں بگڑتی۔ تو اس کی ماں ہے نا اس لئے تجھے اس کی برائی نظر نہیں آتی۔ ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔ آپ جاکر سو جاؤ۔ میں خود سنبھال لوں گی۔ ویر کور نے بحث ختم کرانے کی کوشش کی۔ سکول جانے سے قبل ہی امن نے سارا گھر سر پہ اٹھا رکھا تھا۔ وہ زور زور سے رو رہا تھا۔

" میری گولی کہاں گئی ؟ میری گولی کہاں گئی ؟" ہرچرن آئینے کے سامنے پگڑی باندھ رہا تھا۔ شور سن کر امن دیپ کے قریب آگیا اور پوچھا

" ساڈا پتر کیوں رو رہا ہے، کی گل ہے ؟ آں آں

" آں آں میری گولی کہاں گئی ؟" وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولا " میں نے بیگ میں رکھی تھی۔" " ابھی ڈھونڈتے ہیں۔" ہرچرن اٹھنے والا ہی تھا کہ اتنے میں امن کی دادی آگئی۔

" او پتر جو گولی اسے کھیتوں میں ملی تھی، میں تے رات کو بیگ سے نکال کر طاق میں رکھ دی تھی۔"

" دے دے ماتا اس کو گولی ورنہ یہ سکول وی نہیں جائے گا۔"

ویر کور نے گولی امن کی ہتھیلی پہ رکھتے ہوئے کہا : " یہ لے، آگ لگے اس کمبخت کو جب سے گھر میں آئی ہے کاں کاں مچی ہوئی ہے۔ پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے"۔ کرتار صبح سویرے ہی شہر چلا گیا تھا۔ سکول سے آتے ہی امن سکھے کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ وہ سکھے کے باپ جندے سے ملا :

" باپو ! اے میرا دوست امن دیپ ہے۔ اس کے پاس گولی ہے۔"

" گولی "

" ہاں ! باپو یہ کہتا ہے مجھے اپنے باپو سے بندوق لے کر دو۔ میں اس میں یہ گولی چلاؤں گا۔

ابھی اس نے امن کی ضد پر اس کے لئے بنوایا تھا۔ کتنا شوق تھا اسے دادا کے ساتھ کھیتوں میں ہل چلانے کا اور اب وہی ہل گھر کے ایک کونے میں بے کار پڑا ہوا تھا۔ امن شہر کے ہائی اسکول میں داخل ہو گیا ہر چرن نے اسے نئی سائیکل لے کر دی تاکہ وہ شام کو آرام سے گھر لوٹ آئے۔ لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے۔ اس کی عادتیں بگڑتی گئیں ہر چرن تو پولٹری کے کام میں مصروف ہوتا لیکن جٹی جان بوجھ کر اپنے فرض میں کوتاہی کر رہی تھی۔ اب کبھی کبھی شام کو امن گھر لوٹتا ہی نہیں اور کبھی آدھی رات کو۔ دادا کے پوچھنے پر وہ بھڑک اٹھتا۔ اور اس کی وکالت کرنے آجاتی اس کی ماں "جٹی" میرا لاڈلا آگیا۔ آپتر کھانا کھالے گولی امن کے ذہن میں خون کی طرح گردش کر رہی تھی۔ ایک دن کرتار سنگھ مویشیوں کا گوبر سمیٹ رہا تھا کہ امن اپنے ساتھ ایک اجنبی کو لیکر آنگن میں داخل ہوا۔

"داداجی! یہ میرا دوست ناصر ہے۔ یہ کشمیر کا رہنے والا ہے"

"اچھّا اچھّا پتر بیٹھ جا۔ بہو باہر گئی ہے، آتی ہی ہو گی۔"

کرتار نے ویر کور کو آواز دی تو ویر کور لسّی کے دو بڑے گلاس لیکر آئی۔ دونوں نے لسّی پی لی۔ کرتار نے گوبر سے بھرے ہاتھ دھوئے اور ان کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا:

"پتر کیسے آنا ہوا" کرتار نے کپڑے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے پوچھا۔

"داداجی میں یہ کہنے آیا تھا کہ اب میں پڑھائی نہیں کروں گا۔"

"کیا؟" کرتار کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

"تو کیا کہہ رہا ہے پتر؟"

"ہاں! داداجی میں ناصر کے ساتھ بیوپار کروں گا۔"

"ہرچرن! امن آج کل جندے کے گھر جانے لگا ہے۔ اب وہ بڑا ہو گیا ہے۔ وہ اس گولی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا۔ وہ دن بدن سمجھدار ہو رہا ہے۔ اس کا جندے کے گھر جانا ٹھیک نہیں۔ جندا کئی بار ناجائز اسلحہ رکھنے کے جرم میں جیل جا چکا ہے۔ ایک بار تو اس کے پاس سے دیس کے اہم دستاویز اور نقشے بھی پکڑے گئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ پیسہ خرچ کر کے اسے سزا نہیں ہوئی۔ رشوت کا بازار گرم ہے۔"

ہرچرن چپ چاپ سب کچھ سُن رہا تھا۔ جیتی بیچ میں بول پڑی۔

"بھائیا جی۔ کسی کے پاس جانے سے کوئی بُرا نہیں ہو جاتا۔ یہ تو اپنی اپنی سوچ ہے"۔

"ارے پگلی بچوں کے ذہن کچے ہوتے ہیں۔ ان کے دماغ میں جو بات بھر دی جائے وہ اسی کا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر بچے کا مستقبل سنوارنے میں ماں کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ جس طرح اس کی پرورش ہوگی آگے چل کر وہ اسی طرح بنے گا۔ ماں چاہے تو بچے کو ڈاکو بنا سکتی ہے۔ ماں چاہے تو بچے کو بادشاہ بنا سکتی ہے۔ میرا فرض تھا سمجھانا۔ جو جی میں آئے کرو۔ کل پچھتانا مت۔" کرتار اٹھ کر چلا گیا۔ دن گزرتے گئے۔ کرتار سنگھ کا ناتواں جسم زمین پر ہل جوتتا رہا۔ امن دیپ مڈل پاس کر چکا تھا۔ اب پڑھنے شہر کے ہائی اسکول جانا تھا۔ کرتار فکرمند تھا کہ شہر میں جا کر اس کی عادتیں بگڑ جائیں گی۔ کرتار سنگھ چاہتا تھا کہ امن اب فوج میں بھرتی ہو جائے۔ اس طرح گورچرن کی یاد تازہ ہو جاتی۔ امن تھا کہ ان دیکھی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کرتار نے کئی بار امن سے کہا کہ وہ کھیتوں میں میرے ساتھ کام میں ہاتھ بٹائے۔ لیکن امن تھا کہ ہل کے پاس جانے سے کترا رہا تھا۔ تنہائی میں کرتار اس کھلونے نما ہل کو غور سے دیکھتا جو

"کیا بات ہے امن ؛ بڑے خوش لگ رہے ہو۔"

"ہاں اُستاد ! وہ مال میں نے صحیح سلامت پہنچا دیا ہے۔"

"ویری گڈ۔ تو امتحان میں پاس ہو گیا۔ یہ لے جا، کر عیش" جندے نے اسے کچھ نوٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔ جنٹی بستر پر پڑی کراہ رہی تھی۔ امن کئی دنوں سے گھر نہیں لوٹا تھا۔ اس کی ماں کا دل گھبرا رہا تھا۔ ہرچرن نے کہا خود آ جائے گا۔ ہم سے پوچھ کر اسے اجازت دی تھی۔ یہ سنتے ہی جنٹی بھڑک اٹھی۔ تم چاہتے ہو کہ دادا کی طرح امن بھی ساری عمر ہل چلاتا رہے۔ وہ کسی لائق نہ بنے۔ وہ ترّقی نہ کرے۔ تم سب اس سے جلتے ہو۔

"بہو ایسی بات نہیں ہے، امن کوئی اچھّا کام کرے تو خاندان کا نام روشن ہو گا۔ ہمیں تو خوشی ہے کہ وہ کسی لائق بنے۔"

آفتاب تھک کر آرام کرنے کی غرض سے پہاڑی کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ ہرچرن نے اٹھ کر لالٹین جلائی۔ سارا کمرہ روشنی سے جگمگانے لگا۔ کرتار اور ویر کور ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ اور ہرچرن جنٹی کی چارپائی کے پاس بیٹھ گیا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ تو جنٹی اٹھ کر ایکدم بیٹھ گئی۔ "میرا امن آ گیا، میرا امن آ گیا۔ ذرا دروازہ کھولو۔"

ہرچرن نے دروازہ کھولا تو سامنے رحیم اور احسان کھڑے تھے۔ "آؤ آؤ چاچا۔"

"کیا بات ہے بہو کو ؟" رحیم چاچا نے کرتار کے پاس چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اپنے لاڈلے بیٹے امن کے بچھڑنے کا غم ہو گیا۔ کمبخت ہفتے بھر سے گھر نہیں آیا۔"

"بھائیا جی ! بھابی کو اسپتال لے چلیں۔"

" بیوپار کرے گا۔ تجھے کس چیز کی کمی ہے۔ تجھے کام کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اچھا خاصا باپ کا پولٹری فارم چل رہا ہے، اپنے کھیت ہیں۔ سب واہے گورو کی کرپا ہے۔ اگر کام کرنا ہی ہے تو میرے ساتھ ہل پکڑ لے۔"

" اُف او، دادا جی میں کام پیسوں کے لئے تھوڑے ہی کر رہا ہوں۔ مجھے تو بس شوق ہے۔"

" لیکن پتر بیوپار کرنے کے لئے روپیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا تمہارے پاس ہیں؟"

" دادا جی جو کام کرنے ہم جا رہے ہیں، اس میں روپیوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

" ایسا کام کون سا ہے پتر؟"

" دادا جی اس کو امپورٹ ایکسپورٹ کہتے ہیں۔ یعنی اِدھر کا مال اُدھر اُدھر کا مال اِدھر۔"

" پتر یہ کام کرنے سے پہلے ایک بار اپنی ماں سے پوچھ لے۔ میرا دل تو گھبرا رہا ہے۔"

" ماں کی فکر آپ نہ کریں۔ ان سے میں نے کل ہی پوچھ لیا تھا۔ انہوں نے اجازت بھی دے دی ہے۔"

کرتار حیرت میں ڈوب گیا۔ " ٹھیک ہے پتر! اگر تمہاری ماں نے اجازت دے دی ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

" اچھا دادا جی، ست سری اکال، چلتے ہیں، اچھا ست سری اکال"

جندا اپنے مکان کے برآمدے میں بیٹھا۔ نوٹوں کی گڈی گن رہا تھا۔ کہ امن آ دھمکا۔

ہرچرن بیچارہ چپ ہوگیا ۔ امن صبح سویرے ہی جین کی جیکیٹ اور پتلون پہن کر نکل گیا۔ ہرچرن پولٹری میں بیٹھا حساب کر رہا تھا اور احسان پیٹیوں میں انڈے پیک کروا رہا تھا کہ اچانک کیبن میں کوتوال داخل ہوگیا۔ پولیس کو دیکھ کر ہرچرن اور احسان ششدر رہ گئے۔

" آئیے کوتوال صاحب، کیسے آنا ہوا ؟"

" تمہیں میرے ساتھ کوتوالی چلنا ہوگا ۔"

" لیکن کیوں ؟"

" تمہارے بیٹے امن دیپ سنگھ کو جندے اور سکھے کے ساتھ ناجائز اسلحہ رکھنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے ۔"

" کیا ؟" احسان اور ہرچرن کے اوسان خطا ہوگئے۔ ہرچرن کے کانوں میں کرتار کا ایک لفظ بازگشت کر رہا تھا۔ وہ کوتوال کے ساتھ کوتوالی چلا گیا۔ احسان نے جاکر کرتار اور رحیم کو بتایا تو انہیں کافی دکھ ہوا۔

" میں پہلے ہی کہتا تھا کہ جندا اچھا آدمی نہیں ہے"۔ کرتار بھرائی ہوئی آواز میں رحیم سے بولا۔ ہرچرن کوتوالی سے لوٹا تو اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا وہ باپ کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا۔ کرتار خود ہی اس کے پاس چلا گیا۔

" چرن، پتر، دل چھوٹا نہ کر۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ شہر چل کے کسی وکیل سے مشورہ کرتے ہیں اور اس کی ضمانت کرا لیتے ہیں۔"

" نہیں بھائیا جی، کبھی نہیں، وہ آستین کا سانپ ہے۔ اس نے اس دیش کو، اس پنجاب کو، اس گھر کو سب کو ڈسا ہے۔ آپ کو جانا ہے تو آپ جاؤ۔ میں کبھی نہیں جاؤں گا۔"

" اچھا ٹھیک ہے، میں اور احسان چلے جاتے ہیں۔ دیکھ ویر کور اور جیتی کو اس بات کی بالکل خبر نہیں ہونی چاہیے۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ امن کے آتے ہی یہ خود ٹھیک ہو جائے گی۔"

"ارے کرتار سنا تم نے شہر میں ناجائز اسلحہ پکڑا گیا ہے۔ اور وہ گروہ فرار ہو گیا ہے۔ یہ اسلحہ ہمارے پنجاب میں بدامنی پھیلانے کے لئے لایا گیا تھا۔ جانے یہ کون لوگ ہیں جو پنجاب کی ترقی اور خوشحالی سے جلتے ہیں۔ ہمارا پنجاب اتنا خوشحال ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اسلحہ پکڑا گیا، ورنہ نہ جانے کیا ہو جاتا۔ اچھا کرتار میری نماز کا وقت ہو گیا ہے اگر امن نہ آیا تو مجھے خبر کرنا۔ اچھا ہم چلتے ہیں، احسان بیٹا آؤ چلیں۔"

وہ کمرے سے باہر نکل گئے۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی کہ امن گھر آیا۔ اسے دیکھ کر جیتی کے جسم میں جان سی آ گئی۔ وہ چارپائی سے اتر کر امن سے لپٹ گئی۔

"میرا پتر کہاں تھا؟"

"ماتا جی شہر میں تھا۔ بزنس میں تو وقت لگتا ہے۔"

"اچھا پتر! چل کھانا کھا لے۔"

"ماتا جی میں نے کھانا کھا لیا ہے۔"

"کہاں سے پتر؟"

"جندا چاچا کے گھر سے۔"

یہ سن کر ہرچرن کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔

"تجھے دادا جی نے کہا تھا کہ جندے کے گھر نہیں جانا، تو پھر گیا۔"

"بھائیا جی آپ لوگ ایسے ہی اس پہ شک کرتے ہیں۔" امن اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جیتی ہرچرن پر برس پڑی۔

"میرے لال کو آتے ہی پکڑ لیتے ہو۔ اسے اب کچھ نہیں کہنا۔"

ہتھوڑا اٹھایا ہی تھا کہ اچانک اس کی نظر دروازے پر مرکوز ہوگئی۔ امن ان کی طرف دوڑ رہا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

"داداجی مجھے بچا لیجئے۔ داداجی۔"

کرتار کے ہاتھوں سے ہتھوڑا اور ہل چھوٹ گیا۔ امن کرتار سے لپٹ گیا۔ "داداجی آپ ٹھیک کہتے تھے۔ یہ گولی انسان کی دشمن ہے۔ مجھے آج اس بات کا احساس ہوا ہے۔"

امن کو اس حالت میں دیکھ کر ویرکور اور جیتی دوڑی دوڑی وہاں پہنچ گئیں۔ "میرے پُتر کو کیا ہو گیا۔ میرے بچّے کو۔"

ہرچرن جو اب تک خاموشی سے کچھ سن رہا تھا کھڑا ہو گیا اور امن کو زبردستی کرتار سے الگ کرتے ہوئے بولا:

"بس کر اب اور ڈرامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خوب خاندان کا نام روشن کیا ہے۔ یہ شریف انسانوں کا گھر ہے۔ یہ گھر اس دیش بھگت سپاہی گورچرن کا ہے جس نے ہنستے ہنستے دیش پر اپنی جان قربان کر دی۔ اور ایک تو ہے کہ پنجاب کو برباد کرتے پر تُل گیا ہے۔ اپنے دیش کے ساتھ غدّاری کر رہا ہے۔ ارے بے شرم اپنے دادے کی پیٹھ دیکھ۔ یہ چمڑی جنگ میں مورچوں تک اسلحہ پہنچاتے ہوئے اتری ہے۔ تجھ جیسے دیش دشمن کے لئے اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"چرن پُتر اسے معاف کر دے۔ قانون اسے خود سزا دے گا۔"

"نہیں بھائیا جی۔ یہ ہمارے خاندان پر دھبّہ ہے۔"

امن ایک بار پھر کرتار سے لپٹ گیا۔ "دور ہو جا بھائیا جی سے"

"نہیں مجھے بھایا جی سے دور مت کرو۔"

"میں تجھے قانون کے حوالے کروں گا۔ چل میرے ساتھ کوتوالی۔"

کرتار اور احسان نے شہر جاکر وکیل سے کاغذ وغیرہ تیار کروائے۔ وکیل نے ایک ہفتے بعد آنے کو کہا۔ وہ دونوں گھر لوٹ آئے۔ گھر آتے ہی انہیں ہرچرن نے خبر سنائی کہ آپ کے جانے کے بعد کوتوال پھر آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ امن جندا اور سکھا کوتوالی سے بھاگ گئے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم ہے۔ یہ سنتے ہی کرتار کی ٹانگوں سے جان نکل گئی۔ وہ سوچنے لگا ہم نے اس بیوقوف کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ کل اس کی ضمانت ہو جاتی۔ پتہ نہیں کہاں چھپتا پھر رہا ہوگا۔ اتوار کا دن تھا۔ بارش بھی اچھّی خاصی ہو چکی تھی۔ سارے کسان اپنے ہل وغیرہ تیار کر رہے تھے۔ ہرچرن فارم سے جلدی ہی واپس آگیا تھا۔

کرتار اور ہرچرن آنگن میں لگے منو کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر نئے ہل کو جوڑ کر اس پر لوہے کا نیا پھال جو کہ کافی تیز تھا لگا رہے تھے۔ کہ ہرچرن اپنے ہل کو ہتھوڑے سے ٹھوک رہا تھا۔ کرتار کی آنکھوں کے سامنے وہ ہل گھوم رہا تھا جو کبھی اس نے امن کے لئے بنوایا تھا۔ وہ خیالوں کی دنیا میں کھو گیا اسے یاد آیا کہ امن کے بچپن میں جب بھی وہ ہل چلاتا تھا تو امن اس پر بیٹھ کر سواری کیا کرتا تھا اور معصوم سا سوال اس کے نازک لبوں پر مچل اٹھتا۔ داداجی "آپ کسان کیوں ہیں"۔ "پُتر کسان دیش کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ کسان کماتا ہے تو سارا دیش کھاتا ہے۔ دیش کو اپنے کسانوں پر فخر ہوتا ہے۔" "داداجی میں بڑا ہو کر ہل چلاؤں گا اور اس دیش کا کسان بنوں گا۔ آپ میرے لئے نیا ہل بنوا کر رکھنا۔" کرتار اس کے ننھّے ننھّے ہاتھوں کو چوم لیتا اور سوچتا کتنا معصوم ہے یہ بچّہ۔ اس عمر میں اس کے اتنے اونچے خیالات ہیں۔ بڑا ہو کر ضرور یہ دیش کا نام روشن کرے گا۔ کسی کی آواز سن کر وہ خیالوں کی دنیا سے لوٹ آیا اس نے ہل ٹھونکنے کے لئے

کاٹتے ہوئے بولا۔

" بابا جی پہلے دیش پھر بیٹا۔ آج مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ میں پنجاب کی اس پاک دھرتی پر جان دے رہا ہوں۔ میں اس دیش کی مٹی کو سلام کرتا ہوں۔"

" نہیں! نہیں! امن۔ ایسا نہیں کہتے۔"

" دادا جی اپنے امن کی آخری خواہش پوری کرو۔"

"بول پُتر بول۔"

" دادا جی یہ۔ یہ گولی اتنے گہرے گھڑے میں دفن کرو تاکہ پھر کبھی یہ کسی بے گناہ کا خون نہ چکھ سکے۔ نہ ہی کسی دیش بھگت کا پیچھا کر سکے اور نہ ہی کوئی معصوم امن اسے تلاش کرنے کی کوشش کرے"۔ اس نے ہتھیلی دادا کی طرف بڑھائی۔ جس پر ایک زنگ آلود گولی بے بس نظر آ رہی تھی۔

" ہاں! پُتر تیری یہ خواہش میں ضرور پوری کروں گا۔"

" م۔م۔میرا وسدا رہے پنجاب" کہہ کر اچانک امن کی گردن ایک طرف لڑھک گئی۔ کرتار اور ہرچرن کی فلک شگاف چیخ فضا میں تحلیل کر گئی۔ کرتار نے اس کے کیش سنبھالے۔ اور ہرچرن نے اسے ہل پر سے اٹھا کر ایک طرف رکھا۔ وہ نیا ہل جس نے ابھی پنجاب کے کھیت کی مٹی بھی نہیں چکھی تھی خون سے سُرخ ہو گیا تھا۔

"نہیں دادا جی مجھے بچالو، مجھے بچالو۔"

"چل ادھر ہرچرن۔" امن کو اپنی طرف کھینچتا ہوا بولا۔
کرتار اسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔ "چھوڑ دے اسے ہرچرن چھوڑ دے"

"نہیں بھائیا جی۔ میں اسے ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ یہ اپنے ساتھ ہم سب کو مروا ڈالے گا۔" ایک طرف سے کرتار اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا تو دوسری طرف ہرچرن اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ دونوں طرف سے زور زبردستی شروع ہو گئی۔ اچانک امن دونوں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور زمین پر پڑے ہوئے ہل پر اوندھے منہ جا گرا۔ ہل کے آگے لگا ہوا لوہے کا نوک دار پھال اس کے پیٹ میں گھس گیا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ کرتار بھی اس پر گر پڑا۔ امن کی پگڑی دور جا گری۔ اس کے کیش کھل کر بکھر گئے۔ ویر کور نے امن امن چلّانا شروع کیا اور جٹی کے اوپر بے ہوشی کے عالم میں گر پڑی۔"

"امن یہ تو نے کیا کیا پُتر؟"

"دادا جی، میں نے بہت گناہ کئے ہیں۔ قدرت نے مجھے اس کی سزا دی ہے۔ انسان جیل سے تو بھاگ سکتا ہے مگر قدرت سے نہیں۔"

"امن پُتر تو اپنے بوڑھے دادا کو اکیلا چھوڑ کر جا رہا ہے۔" کرتار پشچاتاپ کی آگ میں جلتے ہوئے بولا۔

"نہیں دادا جی! آپ اکیلے نہیں ہیں۔ پنجاب کے ہزاروں بیٹے آپ کے ساتھ ہیں۔ ایک ہل ٹوٹ گیا تو کیا ہوا۔ اس دھرتی پر چلنے والے ہزاروں ہل ابھی سلامت ہیں۔"

نہیں پتر نہیں۔ اپنے پاپا کو معاف کر دے۔ میں جو کچھ کر رہا تھا تیری بھلائی اور دیش کی بھلائی کے لئے کر رہا تھا۔ ہرچرن دانتوں سے ہاتھ

کچا گوشت

چیڑھ اور دیودار کے اونچے اونچے گھنے درختوں کے درمیان سفید رنگ کا یہ خوبصورت بنگلہ افضل خان کا تھا۔ افضل خان جنگلات کا بہت پرانا ٹھیکیدار تھا۔ اس سے قبل اس گاؤں پر اس کے باپ دادا کا دبدبہ تھا۔ اس کے دادا نے اس خوب صورت جگہ کا انتخاب کر کے یہاں پر بنگلہ تعمیر کیا تھا۔ اس کے دادا واقعی ایک بہترین مصوّر تھے۔ جنہوں نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ اس بنگلے میں اینٹیں کم اور دیودار کی بیش قیمت لکڑی زیادہ استعمال ہوئی تھی۔ جہاں آس پاس جنگل ہی جنگل، چاروں سمت ہریالی ہی ہریالی۔ بنگلے کے نیچے شفاف پانی کا بہتا ہوا دریا۔ دور دور تک کھیتوں کو سیراب کرتا ہوا نکل جاتا۔ سامنے ہی ایک بہت بڑا گھاس فارم موجود تھا۔

جہاں سینکڑوں کالے سفید اور جنکبرے گھوڑے ہری ہری گھاس پر ایک ساتھ چر رہے تھے۔ بنگلے سے تھوڑی دور دائیں جانب ایک بہت ہی خوبصورت آبشار جو کہ کافی بلندی سے نیچے گر رہا تھا۔ چاندنی راتوں میں اس آبشار کا منظر قابل دید ہوتا۔ سامنے کی پہاڑی پر بیشمار پگڈنڈیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ عموماً اس راستے سے بکروال لوگ گرمیوں میں ڈھوک اور کشمیر جاتے تھے۔ "ساوجیاں" کا یہ خوبصورت علاقہ

ایجی ٹیشن

"ارے بابو رام..... ! مبارک ہو، سنا ہے تمہارے لڑکے کا نام اس بار ٹیچروں کی لسٹ میں آگیا ہے۔"

"ہاں! آج ہی جوئن کیا ہے اس نے۔"

"لیکن یہاں تو ایم، اے۔ بی، اے والے بیٹھے ہوئے ہیں۔ پھر تمہارا راجو تو دسویں پاس ہے۔ اس کا نام کیسے آگیا؟"

"کیوں؟ وہ گذشتہ دنوں کی ایجی ٹیشن میں پتھر مارنے کے لئے سب سے آگے تھا۔"

"اچھا!

ایک ایک اینٹ میں غریبوں کی آہیں چھپی ہوئی تھیں۔ اس کی بنیادوں میں نہ جانے کتنی معصوم لڑکیوں کی آبرو دفن تھی لیکن پھر بھی اس بنگلے کی شان اونچی تھی۔ شہر سے یہاں آتے ہی اس نے ایک غریب مزدور کی نابالغ بیٹی سے زبردستی شادی کی۔ اس کے دادا نے چار اور باپ نے تین شادیاں کی تھیں۔ اس نے اس روایت کو برقرار رکھا۔ وہ یہاں کا ماحول اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ کہ کس طرح غریبوں کا خون چوسنا ہے۔ اس کی پہلی بیوی میں سے دو اولادیں تھیں۔ ببلی اور ببلو۔ دونوں شہر میں زیر تعلیم تھے۔

آج بنگلے کی صفائی زوروں پر تھی۔ کیونکہ جنگلات کے آفیسر لوتھچ سے آنے والے تھے۔ افضل خان خود منشی کے ہمراہ مزدوروں کے کھاتے میں سود لکھوا رہا تھا۔ افضل خان کا منشی تیس سالہ خوبرو نوجوان تھا۔ وہ کافی شاطر تھا۔ افضل خان کے ساتھ رہ کر وہ اور بھی بہت کچھ سیکھ گیا تھا۔ دریا کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کے پر لطف جھونکے کمرے میں جھانک رہے تھے۔ افضل خان اور جنگلات کے دو بڑے آفیسر صوفے پر بیٹھے رجسٹر کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ میز پر تلے ہوئے مرغے اور انگریزی شراب کی بوتلیں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں ایک آفیسر نے شراب کا پیالہ اٹھا کر لبوں سے لگایا۔ اور چسکیاں لینے لگا

"دیکھو افضل خان تم اپنی حد سے کافی آگے نکل گئے ہو۔ جتنے درخت تمہیں کاٹنے تھے، تم نے اس سے کہیں زیادہ کاٹ لئے ہیں۔" آفیسر نے پیالہ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"حضور! آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔ اس وقت آپ مزہ لیجئے۔ اس موضوع پر بعد میں تفصیل سے بات کریں گے۔"

جسے گلی مدان کہا جاتا تھا۔ اپنے آپ میں پورے کشمیر کا حُسن سموئے ہوئے تھا۔ جنگلات کے آفیسر جب بھی یہاں برائے نام جنگلات کا معائنہ کرنے آتے تو کئی دنوں تک یہاں کے قدرتی حُسن سے لطف اندوز ہوتے اور اپنی راتیں رنگین بناتے۔ یہاں کی دوشیزائیں دودھ کی طرح سفید اور مکھن کی طرح چکنی تھیں۔

یہاں کے لوگ سفید پوش اور شریف النّفس تھے۔ قُدرت کا بے بہا خزانہ یہاں موجود ہونے کے باوجود یہ لوگ تنگ دستی اور مفلسی کے جنگل میں لپٹے ہوئے تھے۔ اس کی اصل وجہ تھی یہاں کے وہ لالچی ٹھیکیدار جو ان لوگوں کو اوپر اٹھنے نہیں دے رہے تھے کیونکہ اگر یہ لوگ پڑھ لکھ جاتے تو ان کی مزدوری کون کرتا۔ ان بیچاروں کی ساری عمر سُود چکانے میں گزر جاتی۔ پر اصل رقم پھر بھی باقی رہ جاتی۔ جسے آنی والی نسلیں چکانے لگتی۔ دن بھر کام کرنے کے بعد انہیں مشکل سے دو وقت کی روٹی نصیب ہوتی۔

افضل خان کی عمر پینتالیس کے قریب تھی۔ اونچا قد، چوڑا سینہ فولادی جسم، خوفناک چہرہ۔ اس پر بڑی بڑی مونچھیں، ہر گھڑی شلوار قمیض میں ملبوس رہتا۔ جب بھی وہ اپنے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل کی طرف نکلتا تو آس پاس کے گاؤں والے سہم جاتے۔ اس کا اس گاؤں پر کافی دبدبہ تھا۔ اس کے لئے غریب کی عزّت کھلونے سے زیادہ قیمتی نہیں تھی۔ جب جی میں آیا اغوا کروالیا۔ جب جی میں آیا کسی کو قتل کروادیا۔ اس کا اونچا بنگلہ دور سے دکھائی دے رہا تھا۔ باب دادا کے بعد افضل خان کے کارناموں نے اسے مزید اونچا کر دیا تھا۔

یہ بنگلہ نہ جانے کتنے بے گناہوں کے لہو سے تر تھا۔ اس کی

جواب دیا۔

"آپ بے فکر ہو جائیں۔ شام تک سب کچھ بندوبست ضرور ہو جائے گا۔" اتنا کہہ کر افضل خان کمرے سے باہر نکل گیا۔ منشی میز کی دراز میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ کہ افضل خان کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"منشی کچھ بندوبست کرو ان سالوں کا۔ ان کا نشہ نہیں اترنا چاہئے۔ ابھی ان سے بہت کام کروانے ہیں۔" یہ سنتے ہی منشی بنگلے سے باہر نکل گیا۔ ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا تو منشی دو لڑکیوں کے ساتھ بنگلے میں داخل ہوا۔

"حضور یہ رہیں بکریاں۔"

"ٹھیک ہے ان کو کمرے میں پہنچا دو۔" جاتے ہوئے دونوں لڑکیوں نے التجیہ نظروں سے پیچھے مڑ کر دیکھا تو افضل خان گرجا۔

"کیا دیکھ رہی ہو۔ جاؤ تمہارے باپ کا سود معاف کر دیا جائے گا" دونوں لڑکیاں بغیر چوں وچرا آفیسران کے کمرے میں چلی گئیں۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی آفیسروں نے انہیں چومنا شروع کیا۔ لڑکی نے ناک سکوڑلی۔ شاید شراب کی بو کچھ زیادہ ہی تھی۔ دوسرے آفیسر نے لڑکی کو لٹا دیا۔ اور اس کی قمیض کا گھیرا اس کی چھاتیوں تک اٹھا کر اس کے پستانوں کو مسلنے لگا۔ جب اس کے جسم کے مسام کھل گئے تو آہستہ آہستہ اس پر جھک گیا۔ کہ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

"اُف او پتہ نہیں کون کمبخت ہے؟" وہ بڑبڑایا۔ اس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے منشی کھڑا تھا۔ اس نے دروازہ واپس بند کر دیا اور اپنی کمر سے تولیہ لپیٹ لیا۔ پھر دروازہ کھول کر پوچھا:

"کیا بات ہے؟"

"نہیں" دوسرا آفیسر بول پڑا۔ "ہمیں گورنمنٹ نے اس لئے یہاں بھیجا ہے کہ معائنہ کیا جاسکے۔ اس لئے بات بھی ہوتی ہے تو ٹھیک ہے۔" اپنی بات ختم کرتے ہی آفیسر نے مرغے کی ایک ٹانگ کو دانتوں تلے دبالیا۔

"حضور! آپ چاہیں تو لکھ سکتے ہیں کہ وہ درخت آگے ہی نہیں تھے"

"کیا؟" آفیسر نے اسے گھور کر دیکھا....

"نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ دیکھو جنگلات کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ گورنمنٹ ہمیں اس کے لئے تنخواہ دیتی ہے۔"

"اجی چھوڑئے صاحب۔ ہمیں سب معلوم ہے۔ کلوزر ایک جگہ لگتا ہو تو کاغذات میں دس جگہوں پہ دکھایا جاتا ہے۔ پچھلے سال ہی یہاں ایک کلوزر لگایا گیا تھا۔ لیکن برائے نام۔"

یہ سنتے ہی دونوں آفیسر ایک دوسرے کو اس طرح دیکھنے لگے جیسے افضل خان نے دُکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا ہو۔ وہ دونوں کھسیانی ہنسی ہنس پڑے ہاہاہاہا۔

"اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"یہی کہ میرا کام ہو جائے اور آپ اپنا حصّہ لے لیں۔"

"نہیں! نہیں! ہمیں کچھ نہیں چاہئے۔" دوسرا آفیسر شراب حلق میں انڈیلتے ہوئے بولا۔

"اچھا اچھا۔ میں سمجھ گیا۔ شاید میں آپ کی اچھی طرح خدمت نہ کرسکا میں جانتا ہوں آپ کو جنگلی بکریاں بہت پسند ہیں۔"

"افضل خان بہت سمجھدار ہے۔" ایک آفیسر نے دوسرے سے کہا۔

"ہاں یار! شباب کے بغیر شراب ادھوری ہے۔" دوسرے آفیسر نے

برآمدے سے نمودار ہوئے۔

"گڈ مارننگ خان" "گڈ مارننگ"

"آئیے آئیے بڑے تھکے ہوئے لگتے ہیں۔"

"ارے خان! کھایا ہوا گوشت ایک بار پھر کھلا دیا۔"

"ارے صاحب! یہاں ایسی کونسی بکری ہے جو آپ تک نہ پہنچی ہو۔ اب چند بکریاں ایسی ہیں جو ابھی میں ہی کر رہی ہیں۔"

"ارے خان! اسی کچّے گوشت کے لئے تو ہم یہاں آئے تھے۔"

"اگلی بار یہ شکایت نہ ہوگی۔ اب وہ درخت نہ اگنے والی فہرست میں درج ہو جائیں گے نا۔"

"ہاں! ہاں! اب تو ضرور درج ہو جائیں گے۔ تم نے اتنی فرصت ہی کہاں دی کہ جنگل کا پوری طرح معائنہ ہو سکے۔"

"ارے صاحب! رات بھر تو آپ جنگل کا معائنہ تو کر رہے تھے۔" پھر تینوں نے مل کر زوردار قہقہہ لگایا۔ دونوں آفیسر تیار ہو کر اپنی جیپ میں بیٹھ کر چلے گئے۔ جیپ کچّے راستے پر دوڑ رہی تھی۔

افضل خان سفید گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل کا کام دیکھنے کے لئے نکل پڑا۔ راستے میں اچانک اس کی نظر ایک مزدور پر پڑی جو ایک پتھر پر دونوں ہاتھ سے سر تھامے بیٹھا ہوا تھا۔ افضل خان گھوڑے سے اتر کر اس کے قریب گیا۔ "اے حرام خور ہم تمہیں کام کرنے کے پیسے دیتے ہیں۔ آرام کرنے کے نہیں۔"

"معاف کریں حضور۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ ادب سے کھڑا ہو کر بولا۔

"روپے لیتے وقت طبیعت ٹھیک ہو جاتی ہے۔ کیا نام ہے تمہارا؟

"صاحب یہاں دستخط کیجئے۔"

"لاؤ ادھر۔ سارا موڈ چوپٹ کر دیا۔"

"ارے صاحب ساری رات اپنی ہے۔" منشی رجسٹر اٹھاتے ہوئے بولا اور چلا گیا۔ آواز سن کر لڑکی نے اپنا جسم چادر سے ڈھک لیا تھا۔ آفیسر نے چادر اٹھا کر لڑکی کے ایک ایک عضو کو چومنا شروع کیا۔ جب وہ پستانوں کو چومنے لگا تو ایک کراہ کمرے میں گونج گئی۔ شاید اس نے اپنے زہریلے دانت اس کے پستانوں میں گھاڑ دئے تھے۔ وہ دونوں بری طرح گرم ہوگئے۔ دوسرا آفیسر اپنا موڈ ابھی تک درست نہیں کر پایا تھا اس نے بڑھ کر شراب کی بوتل اٹھائی اور گلاس میں انڈیل کر لڑکی کی طرف بڑھا دیا "یہ پی لے" لڑکی نے اصرار کیا تو بھڑک اٹھا۔ "پی لے سالی پتہ نہیں کس منحوس نے تجھے یہاں بھیجا ہے۔" اپنے باپ کے نام کی سود کی رقم یاد کر کے وہ کانپ گئی اور گلاس پکڑ کر آنکھیں بند کر کے شراب حلق میں انڈیل لی۔ تھوڑی دیر ہاتھ گرم کرنے کے بعد آفیسر عجیب قسم کی حرکتیں کرنے لگا۔ تو لڑکی پیچھے کھسک گئی۔ آخر کار وہ سائیکل پر سوار ہوگیا۔ مہتاب رات بھر کی تھکان کے بعد آرام کرنے کی غرض سے برف پوش پہاڑوں کے پیچھے چھپ گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد آفتاب نے مشرق سے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ اس کی سنہری کرنیں ساری وادی میں پھیل گئیں۔ چند شعاعیں کھڑکی کی جھری سے کمرے میں داخل ہوگئیں۔

تو آفیسر نے پلنگ پر انگڑائی لی وہ جلدی جلدی بستر سے اٹھا اور تولیہ کمر سے لپیٹ لیا۔ لڑکی کب کی جا چکی تھی۔ تکیے پر پڑے بال دیکھ کر وہ مسکرایا اور باتھ روم کی طرف نکل گیا۔ باتھ روم میں پہلے ہی دوسرا آفیسر نہا رہا تھا وہ دانتن منہ میں لئے کھڑا رہا۔ افضل خان ناشتے کی میز پر ان دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں آفیسر سامنے کے

لیٹے چھت کو گھورنے لگا۔ جو سردیوں کی بارش میں ٹپک ٹپک کر بوسیدہ ہو چکی تھی اور کسی بھی وقت زمین پر سجدہ کر سکتی تھی۔ اتنے میں اس کی بیٹی زونی بغیر دودھ کے نمکین چائے مٹی کے پیالے میں لے کر آئی۔

"بابا! یہ تھوڑا پی لو، ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"لا بیٹی دے دے۔"

غفارے نے اٹھ کر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پیالی پکڑی۔ مکی کی روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ کر اس نے منہ میں ڈالا اور گرم گرم چائے کی چسکیاں لینے لگا۔

"ذرا کچھ پیسے دے دو۔ نمک مرچ لانی ہے۔" زینہ نے اس کے قریب پھڑی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ لو منشی سے لایا تھا۔" غفارے نے واسکٹ کی جیب سے روپے نکال کر زینہ کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ خالی پیالہ ایک طرف رکھ کر غفارا تھکاوٹ دور کرنے کے لئے پھڑی پر لیٹ گیا۔ زینہ چولہا پھونکنے میں لگی ہوئی تھی۔

آج غفارے کی طبیعت ٹھیک تھی۔ وہ صبح سویرے ہی کلہاڑا اٹھا کر لکڑہاروں کے ساتھ کام پر چلا گیا تھا۔ زونی لڑکیوں کے ساتھ آنگن میں چیتو کھیل رہی تھی۔ زینہ دروازے میں بیٹھ کر کنڈور کی سبزی کاٹ رہی تھی۔ اس نے زونی کو آواز دی کہ آٹا گوندلے۔ زونی بڑبڑاتے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔

افضل خان کے بچے شہر سے چھٹیاں گزارنے پچھلے دس دن سے یہاں آئے تھے۔ منشی انہیں کبھی نیزے پرلے جاتا تو کبھی لورن، کبھی گلی ملان کی سیر کراتا تو کبھی نیزے پرلے جاتا۔ افضل خان کی بیٹی سولہ سال کی تھی اور بیٹا دس سال کا تھا۔ وہ دونوں آبشار کے نیچے بیٹھ گئے اور ٹھنڈی فوار جسم پر پڑنے سے ٹھنڈک محسوس کر رہے تھے۔ جب زیادہ ٹھنڈے ہو گئے تو

"غفارا' غفارا"

"اچھّا" افضل خان کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ اس نے منشی کو آواز دی جو تھوڑی ہی دور مزدوروں سے پچّاس روپے دے کر سو کے ہندسے پر انگوٹھا لگوا رہا تھا۔

"آیا حضور"

"منشی! یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں۔"

"سرکار اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' اس لئے۔"

"منشی اگر اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو اسے گھر بھیج دیتے۔ یہاں کیا امداد بٹ رہی ہے جو یہ بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا آج کا دن کاٹ لینا۔ حرام خور کہیں کا۔ کام تو کرتے نہیں قرض کیا خاک چکائیں گے۔" کہہ کر افضل خان گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ غفارے نے اپنا کلہاڑا اور چادر کندھے پر رکھی۔ اور جنگل کے بیچوں بیچ پگڈنڈی پر چلتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔ بھوک سے اس کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ درختوں کا سہارا لیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

اس کا گھر دریا کے پار تھا۔ جس پر لکڑی کا ایک جھولا پل برائے نام تھا۔ غفارے نے گھر میں داخل ہوتے ہی کھانسنا شروع کیا۔

"کیا بات ہے؟" اس کی بیوی دوڑتی ہوئی غفار کے قریب آئی۔ اور اسے سہارا دے کر اندر لے گئی۔

"کچھ نہیں' بس یوں ہی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"اچھّا چلو' آرام کر لو۔" زینہ نے غفارے کو چٹائی پر بٹھا دیا۔ سارے اندر دھوئیں کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ سیاہ جالے لٹک رہے تھے۔ دو تین تھموں کے ساتھ تھوم کی پوٹلیاں لٹک رہی تھیں ... غفارا لیٹے

گئی ۔ منشی گھبرا گیا ۔ " ارے تم تو پوری طرح بھیگ گئی ہو ۔ چلو گھر چل کر کپڑے تبدیل کر لو ۔" پھر وہ ادھورے ارمان لیکر ان کے ساتھ چل پڑا ۔

زونی گھاس کا کھڑا بُن رہی تھی ۔ اس نے پھڑی اور کھڑا بنانا اپنی دادی سے سیکھا تھا ۔ وہ ٹوکری بنانے میں بھی مہارت رکھتی تھی ۔ زیتہ کھڑکی کے پاس بیٹھ کر چرخہ کات رہی تھی ۔ اس کے پاس اُون کا ڈھیر تھا ۔ وہ چاہتی تھی جلدی یہ اُون ختم ہو جائے ۔ تو وہ غفارے کے ہاتھ شہر میں فروخت کرنے کے لئے بھیج دے ۔ زونی نے کھڑا بنا کر ایک طرف رکھا اور باہر نکلنے لگی تو زیتہ نے آواز لگائی ۔ " زونی بیٹی ۔"

" میں چرخہ کات رہی ہوں ۔"

" ذرا بابا کو پار جا کر کھانا دے آؤ ۔" ماں کو مصروف دیکھ کر زونی باپ کا کھانا لے جانے پر راضی ہو گئی ۔ اس نے روٹی کی پوٹلی اٹھائی اور جنگل کی طرف چل دی ۔ غفارا دیودار کے جنگل میں کٹے ہوئے درخت کو کلہاڑے سے چھلکا اتار رہا تھا ۔

" بابا ! میں آگئی " زونی نے درخت کے پیچھے سے چھپ کر غفارے کو آواز دی ۔ غفارے کے ہاتھوں میں چلتا ہوا کلہاڑا رک گیا ۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ۔ " کون ؟"

" میں بابا زونی ۔"

" زونی میری بچی آجا ۔ بالکل ٹھیک وقت پر آئی ہے ۔ سخت بھوک لگی تھی ۔ کیوں بیٹی آج تیری ماں نہیں آئی ۔

" بابا وہ چرخہ کات رہی تھی ۔ اس لئے میں کھانا لے کر آئی ۔"

غفارا کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا ۔ زونی درخت سے اترے ہوئے چھلکے اور چھوٹی لکڑیاں جمع کرنے لگی ۔ وہ دبی زبان

دونوں پانی سے باہر نکل گئے۔ بھیگی ہوئی سفید پوشاک میں ببلی کا حسن
عشق کی دنیا میں جھانک رہا تھا۔ قمیض اس کے جسم کے ساتھ چپک گئی
تھی۔ اس کی چھاتیوں کا ابھار دیکھ کر منشی کے منہ میں پانی آ گیا۔ وہ اپنے
سوکھے لبوں پر گیلی زبان پھیرنے لگا۔ بھیگے ہوئے لباس میں اس کے پستانوں
کی نوک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دونوں بھائی بہن پھر پانی میں
اتر گئے۔ اور ایک دوسرے پر پانی پھینکنے لگے۔ ببلی کی پنڈلیاں اور
کولہے مٹکتے دیکھ کر منشی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے چاہا
کہ آگے بڑھ کر اسے باہوں میں بھر لے۔ وہ اس کے قریب گیا۔ اچانک
اس کے تصور میں افضل خان کا خوفناک چہرہ گھوم گیا۔ منشی کانپ کر رہ
گیا۔ پھر وہ سوچنے لگا۔ جو اوروں کی جوان لڑکیاں آفیسرز کے آگے
پھینک دیتا ہے اگر اس کی بیٹی کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے تو کیا بُرا
ہے۔ وہ منشی سے بے خبر ہو کر پانی سے کھیلتی رہی کہ اچانک ببلو کی آنکھ
میں ریت پڑ گئی۔ وہ آنکھ ملتا ہوا پتھر اٹھائے ببلی کے پیچھے دوڑ پڑا۔
ببلی پچھلے قدموں چلتی ہوئی منشی سے ٹکرا گئی۔ منشی کو لگا جیسے اس نے
بجلی کا ننگا تار چھو لیا ہے۔

"دیکھو انکل یہ مجھے پتھر مار رہا ہے۔" ببلی منشی کے پیچھے چھپتی ہوئی
بولی۔ ببلی کے دونوں ہاتھ اپنے کندھوں پر دیکھ کر منشی کا جسم گرما گیا۔
منشی کے قریب پہنچ کر ببلو نے پتھر پھینک دیا۔ اور ببلی سے مخاطب
ہوا۔ "دیدی آؤ میری آنکھ میں پھونک مارو۔" ببلی منشی کے پیچھے
سے نکل کر ببلو کی آنکھ میں پھونک مارنے کے لئے جھکی۔ تو منشی پنجوں
پر کھڑا ہو کر اس کے گریبان میں جھانکنے لگا۔ جہاں سنگ مرمر کے دو پہاڑ
منشی کا دل للچا رہے تھے۔ اچانک ببلی کی نظر منشی پر پڑی تو وہ سنبھل

چھوٹ کر زمین پر آگرے۔ یہ دیکھ کر افضل خان ہنس پڑا۔

"یہ بچی کس کی ہے؟"

"مجھ بدنصیب کی ہے حضور۔" غفار ڈرتے ڈرتے بولا۔

"غفار چاچا، تم تو خوش نصیب ہو۔ جس کے گھر میں چاند جیسی بیٹی نے جنم لیا ہے۔" افضل خان گھوڑے سے اتر کر زونی کے قریب ہونے لگا۔ تو زونی پیچھے پیچھے کھسکنے لگی۔

"ارے ڈرو نہیں۔ تمہارا کیا نام ہے؟"

زونی کے نازک لب آپس میں ٹکرائے۔ "جی زو.... زونی... وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

"زونی یعنی چاند۔ سبحان اللہ، بالکل چاند کی طرح۔ تم اس جنگل میں کیا کرنے آئی ہو۔ تمہیں معلوم نہیں اس جنگل میں خطرناک جنگلی جانور ہیں۔ "حضور یہ میرا کھانا لیکر آئی تھی۔"

"اچھا اچھا اپنے بابا کا خاص خیال رکھتی ہے۔ غفارا ابھی ابھی تم کہہ رہے ہو کہ تم بدنصیب ہو۔ دیکھو غفارا، اگر تمہاری صحت ٹھیک نہیں ہے تو آپ آرام کر سکتے ہو۔ کام تو ہوتا ہی رہے گا۔ تمہارا دن ہی کاٹا جائے گا۔"

غفارا پھٹی پھٹی آنکھوں سے افضل خان کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ سب خواب تو نہیں۔

"منشی جی اسے گھر بھیج دو۔"

"اچھا حضور" غفارے نے کھانے کی پوٹلی اور کلہاڑا اٹھایا۔ زونی نے لکڑیوں کا چھوٹا سا گٹھا سر پہ اٹھایا۔ اور چل پڑے۔ ببلی اپنی خوابگاہ میں پلنگ پر سوئی ہوئی تھی۔ ساتھ والے کمرے کے روشندان سے منشی

میں کوئی پہاڑی گیت گنگنا رہی تھی۔ ابھی وہ گیت پورا بھی نہ کر سکی تھی کہ گھوڑے کے دوڑنے کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس کے ہاتھ رک گئے۔ " بابا یہ آواز "

" بیٹی یہ آواز افضل خان کے گھوڑے کی ہے۔ وہ ضرور ادھر آرہا ہوگا" غفارے کو اس دن کی ڈانٹ یاد تھی۔ وہ جلدی جلدی نوالے حلق میں اتارنے لگا۔ کر روٹی کا ایک ٹکڑا اس کے حلق میں اٹک گیا۔ اور وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ اس نے جلدی سے مٹی کے پیالے میں رکھا ہوا پانی پیا تو اس کی کھانسی قدرے کم ہوئی۔ اتنے میں افضل خان کا گھوڑا اس کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ " آج پھر تو ....." اتنا کہتے ہی افضل خان کی نظر زونی پر پڑی۔ اس نے اپنے گھوڑے کا رخ پیچھے موڑ دیا۔ جہاں منشی گھوڑے کی آواز سن کر پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ افضل خان نے منشی کے قریب جاکر پوچھا " یہ لڑکی کون ہے ؟"

" حضور اپنے ہی کمہار کا گھڑا ہے۔" منشی کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا

" پھر تو اس گھڑے کا پانی کافی ٹھنڈا ہوگا"

" اور حضور میٹھا بھی"

افضل خان کی آدم خور آنکھیں زونی کے جسم پر جم گئیں۔ اس نے زونی کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ زونی کا چہرہ اچانک کشمیر کے سیب کی طرح سرخ ہوگیا۔ اس کی کھلی ہوئی زلفیں ہلکی ہلکی ہوا سے اڑ کر اس کے رخساروں پر پھیل جاتی تھیں۔

اس کی جوانی کے آفتاب نے افضل خان کے پتھر دل کو موم کی طرح پگھلا دیا۔ اس کے سینے کا ابھار دریا کے پانی کی طرح اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ افضل خان کا خوفناک چہرہ دیکھ کر زونی کے ہاتھوں سے لکڑی کے ٹکڑے

"ہاں" - "حکم کیجئے"

"ہمیں تم پر بے حد غصّہ ہے" "کیوں خان صاحب." منشی کا دل بیٹھا جا رہا تھا - اس نے سوچا شاید افضل خان کو اس کی حرکتوں کا پتہ چل گیا ہے - افضل خان نے حقّے کی نال ایک طرف رکھتے ہوئے کہا - " اس لئے کہ تم نے آج تک ہمیں کیوں نہیں بتایا کہ غفارے کی بیٹی اتنی خوب صورت اور حسین ہے - منشی کے دل میں آیا کہ وہ بھی اسے پوچھے کہ تم نے بھی تو اب تک مجھے نہیں بتایا کہ تمہاری بیٹی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی ہے پھر وہ بات بدلتے ہوئے بولا - بات دراصل یہ ہے کہ جب پہلی بار میں نے غفارے کی بیٹی کو دیکھا تو وہ صرف شعر کا ایک مصرعہ تھی - اس کے جسم پر کونپلیں نہیں پھوٹی تھیں - اس کے چہرے کے آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا - لیکن آج - آج تو وہ میرؔ کی مکمّل غزل بن چکی ہے - اس کے جسم پر جوانی کے پھول کھل کر مہک رہے ہیں - اس کا چہرہ مہتاب بن کر جگمگا رہا ہے - اسی لئے تو آج تک اس چاند کی روشنی آپ تک نہیں پہنچ سکی -

" دیکھو منشی اس بار خیال رکھنا - پہلے ہی ہمارا بہت نقصان ہو چکا ہے چند دنوں کے بعد جنگلات کے بڑے آفیسر آ رہے ہیں - ان کے آگے ہڈی ڈال کر اپنا کام کروالیں گے -"

" لیکن حضور وہ تو ابھی نابالغ ہے - ارے بے وقوف کچّے گوشت کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے - جب کبھی تمہیں کچّا گوشت چکھنے کا موقعہ ملے تو دیکھ لینا -" یہ سنتے ہی منشی کی آنکھوں کے سامنے بیلی کا بھیگا ہوا گورا بدن گھوم گیا -

" وہ بھی تو ابھی کچّا گوشت تھی" منشی ایک دم بولا - "ہاں حضور کچّے گوشت کا مزہ ہی اپنا ہے -" اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب اس کی زبان دانتوں تلے کٹ گئی - جیپ کا ہارن سن کر افضل خان صدر دروازے پر پہنچ گیا.

چھپ کر جھانک رہا تھا۔ ببلی نے جاگ کر ایک بھرپور انگڑائی لی۔ جب سے منشی نے ببلی کو سفید رنگ کی گیلی پوشاک میں دیکھا تھا اس کا ایک ایک عضو منشی کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔

اس کی راتوں کی نیند حرام ہو چکی تھی۔ اسے ارمان تھا کہ ایک بار صرف ایک بار وہ ببلی کو اپنی باہوں میں لیکر چوم لے۔ پھر جو ہو سو ہو۔ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ عفارا گھر پہنچا تو زینہ پر برس پڑا۔

"تم نے زونی کو اکیلے ہی جنگل میں کیوں بھیج دیا۔ تمہیں معلوم نہیں اس جنگل میں انسان بھیڑیوں کے لباس میں گھومتے ہیں" تو کونسا قہر ٹوٹ پڑا۔ قہر ٹوٹا کہ دلوٹا۔ سمجھ لو آج پہلی بار افضل خان نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا اور مجھ پر رحم کھانا شروع کیا۔ تو کیا ہوا اس کے گھر میں بھی جوان لڑکی ہے۔ ہمارے بزرگ کہتے تھے جو کسی کی دیوار سے مٹی اٹھائے گا اس کی دیوار سے بھی کوئی پتھر اٹھائے گا۔ تم ڈرتے کیوں ہو۔ گاؤں والے زندہ ہیں مر تو نہیں گئے۔ آج تک اس گاؤں میں کتنی لڑکیوں کا اغوا ہوا۔ عزّت لٹی۔ کس نے پوچھا۔ پولیس بھی بڑے لوگوں کا ساتھ دیتی ہے۔ یہ بھیڑیا ہے تو وہ وردی والے بھیڑئے ہیں۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں جو اس کے خلاف آواز اٹھا سکے۔ کچھ کہو تو ادھار کی رقم مانگنے آجاتا ہے۔ ہم غریبوں کی بے بسی کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ زونی کے ابّا! اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ وہ خود بدلہ لے گا گناہوں کا۔ دیکھو آج کے بعد کبھی زونی کو اکیلے جنگل میں مت بھیجنا۔ چاہے میں بھوکا ہی کیوں نہ مر جاؤں۔ عفارے کا گلہ رندگیا تھا۔ ٹھیک ہے اب غصّہ تھوک دو۔ پھر عفارا بیٹھ گیا۔ افضل خان منڈیر پر بیٹھا حقّہ پی رہا تھا کہ اتنے میں منشی اندر آگیا۔" آپ نے مجھے یاد کیا

اٹھاکر وہ آدمی بنگلے تک پہنچ گیا۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ سیدھا سنگھ صاحب کے کمرے میں چلاگیا۔

"منشی شاباش۔ اب ایک کام اور کرو۔ بیلی اور ببلو کو میں نے آبشار پر سیر کرانے بھیجا ہے۔ کل وہ شہر چلے جائیں گے۔ تم ان کو وہیں پر مصروف رکھو تاکہ وہ یہ تماشا نہ دیکھ سکیں۔"

"لیکن قدرت تو یہ تماشا دیکھ رہی ہے"

"کیا مطلب"

"کچھ نہیں حضور۔ مذاق کرنے کی عادت ہے"۔

"ہمیں ایسا مذاق بالکل پسند نہیں ہے۔ دیکھو جب تک ہم نہ پہنچیں تم انہیں مصروف رکھنا۔"

"ٹھیک ہے حضور۔" منشی سیدھا آبشار پر چلاگیا۔ زونی نے دروازہ کھولنے کی ناکام کوشش کی لیکن سنگھ نے اس کی نازک کلائی پکڑ کر کھینچا۔ اور زونی اس کے سینے سے لگ گئی۔

"خدا کے واسطے مجھے چھوڑ دو۔ میری سگائی ہو چکی ہے۔ میں کسی کی امانت ہوں۔" زونی سنگھ کے آگے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا رہی تھی۔

"ارے پگلی مشکل سے آج کچّا گوشت چکھنے کا موقعہ ملا ہے' وہ بھی چھوڑ دوں۔ جتنا مرضی چلّاؤ' شور مچاؤ۔ تمہاری آواز چاردیواری سے باہر نہیں جاسکتی۔" سنگھ نے اسے اٹھاکر پلنگ پر پٹخ دیا اور لائٹ بند کردی زونی نے بتی پھر جلادی۔

"اچھا اچھا تمہیں اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔ پہلا دن ہے نا۔ جب گوشت پک جائے گا تو ڈر خود بخود دور ہو جائے گا۔ ٹھیک ہے میں سب کچھ اجالے میں ہی کروں گا۔" زونی زور زور سے چلّانے لگی۔ مگر

" آئیے آئیے صاحب میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ پچھلے دنوں مہرہ صاحب نے بتایا تھا کہ آپ آ رہے ہیں اور کل ٹیلیفون بھی آیا تھا لیکن آپ اکیلے ہی کیوں آئے۔" افضل خان ایک ہی سانس میں سب کچھ پوچھ بیٹھا۔

" بیوی تو شہر کے ڈاک بنگلے میں ٹھہری ہوئی ہے۔" سنگھ صاحب سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولے۔

" صاحب اُن کو بھی ساتھ لے آتے ۔ سیر کر جاتیں۔"

" افضل خان بات در اصل یہ ہے کہ پکا ہوا گوشت کھاتے کھاتے منہ کا ذائقہ ہی ختم ہو گیا ہے۔ مہرہ صاحب کہہ رہے تھے کہ تم نے کچّے گوشت کا انتظام کر رکھا ہے۔"

" ہاں! ہاں! حضور بالکل کیا ہے۔" سنگھ صاحب بنگلے میں داخل ہو گئے۔

" سنگھ صاحب وہ ہمارے ٹینڈر کا کیا ہوا۔"

" ارے ہاں مبارک ہو خان تمہارا کام ہو گیا۔ اعلیٰ سطح کی سفارش کروانی پڑی۔ اب کی بار بھی ٹھیکہ تم ہی کو ملا ہے۔ ہمیں دعائیں دو۔"

" کیوں نہیں حضور۔ ہم خادم کس کے ہیں۔" افضل خان کاغذات لیتے ہوئے بولا۔ اور اٹھ کر منشی کے پاس چلا گیا۔ اس کے کان میں کچھ کہہ کر وہ واپس چلا آیا۔ آسمان پوری طرح صاف تھا۔ چودھویں کا چاند پورے شباب پر تھا۔ اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں آرام کر رہے تھے۔ منشی نے غفارے کے دروازے پر دستک دی تو زونی نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی منشی کے ساتھ آئے ہوئے آدمی نے زونی پہ کمبل ڈال دیا اور کاندھے پر اٹھا لیا۔ اس نے کافی شور مچایا لیکن اس کی آواز کمبل میں دب کر رہ گئی۔ وہ ہاتھ پیر مارتی رہی لیکن چاندنی کا فائدہ

رہا۔ ببلو چھوٹے چھوٹے کنکر آبشار کے قریب کی جھیل میں پھینک رہا تھا۔ منشی آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچا اور اسے جھیل میں دھکیل دیا۔ وہ زور زور سے چلّانے لگا۔ ببلی نے پیچھے سے منشی کے بال پکڑ لئے۔

"کمینے تو نے میرے بھائی کو کیوں دھکا دیا؟"

منشی نے مڑ کر ببلی کو اپنی باہوں میں جکڑ لیا۔

"اس لئے جانِ من کہ تمہیں اپنی باہوں میں بھر سکوں" منشی زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ادھر افضل خان بہت خوش تھا کہ آج اس نے کچے گوشت کے عوض لاکھوں روپے کا ٹھیکہ حاصل کیا ہے۔ اس نے گھڑی دیکھی اور بڑبڑایا۔ "اب مجھے ببلی اور ببلو کو لانے جانا چاہئے۔ وہ آبشار پر پہنچا وہاں گرتے ہوئے آبشار کا شور تھا۔ وہ ببلی اور ببلو کو اِدھر اُدھر ڈھونڈنے لگا۔ اچانک اس کی نظر اس جھاڑی پر جم گئی جہاں لال شلوار خطرے کا اعلان کر رہی تھی جو یقیناً ببلی کی تھی۔ افضل خان فوراً وہاں پہنچا جہاں منشی ببلی پر جھکا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ افضل خان ہاتھوں میں اٹھایا ہوا پتھّر اس کے سر پر دے مارتا تب تک منشی کچّے گوشت کا ذائقہ چکھ چکا تھا۔

بیہودہ۔ یہاں اس کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔ وہ سنگھ صاحب کے بازوؤں میں ایسے جکڑی ہوئی تھی جیسے بھیڑئیے کے پنجوں میں معصوم ہرنی۔ سنگھ صاحب کی آنکھیں شراب کے نشے سے سرخ ہوگئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ہوس کی آگ دہک رہی تھی۔ اس نے زونی کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر قمیض چاک کردی۔

"نہیں" زونی نے ایک زوردار چیخ ماری "مجھے چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔" لیکن سنگھ صاحب نے اس کی التجا نظر انداز کرتے ہوئے اس کی شلوار کی ڈوری ایک ہی جھٹکے سے توڑ کر پھینک دی۔ زونی کے ہاتھ ایک لمحے کے لئے کھلے تو اس نے سنگھ کا منہ نوچ لیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے زونی کو پھر دبوچ لیا۔ زونی کا سنگ مرمر جیسا گورا بدن سنگھ کی باہوں میں کسمسا کر رہ گیا۔

سنگھ اپنا کھردرا جسم اس کے چکنے بدن پر رگڑ رہا تھا۔ زونی کے کالے بال سفید تکیئے پر اس طرح بکھرے ہوئے تھے جیسے ہزاروں ناگنیں ایک ساتھ پلنگ پر رینگ رہی ہوں۔ تکیہ اس کے آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔ سنگھ نے اس کی دونوں باہیں پلنگ کے ساتھ دائیں بائیں پکڑ کر رکھی تھیں۔ اس نے زونی کی چھاتی سے منہ اٹھا کر اس کے دائیں رخسار پر اپنے زہریلے دانت گاڑ دئے۔ ایک اور چیخ کمرے کی دیواروں کے ساتھ ٹکرا کر دم توڑ گئی۔ پھر سنگھ نے اپنے جسم سے آخری لباس اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر پھینک دیا۔ اور زونی پر پوری طرح جھک گیا۔

زونی نے پلنگ پر بچھے ہوئے گدّے مضبوطی سے پکڑ لئے۔ اس کے ناخن گدّوں میں خنجر کی طرح پیوست ہوگئے۔ اور پھر ایک چیخ کے ساتھ زونی کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ سنگھ دیر تک حسن کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتا

ایک دوست تھے - انہیں اولاد کی خوشیاں بے حد عزیز تھیں - زہرہ اپنے چھوٹے بھائی شارق سے چھیڑ چھاڑ کئے جا رہی تھی - شارق کی شادی کیلئے جس لڑکی کا انتخاب کیا جا رہا تھا شارق اسے ردّ کر چکا تھا -

زہرہ چاہتی تھی کہ اب اس گھر کے آنگن میں شارق کے بچّے کھیلیں - کاشف تو انگلینڈ کا ہو کر رہ گیا تھا - اس کے بچوّں کو بھی کسی نے نہیں دیکھا تھا - عدنان بھائی زہرہ کی پُرزور حمایت کرتے تھے - ماں بھی بیچ بیچ میں کوئی فقرہ چُسپت کر دیتی تھیں -

آج جب میں عدنان بھائی کے ایک کنال زمین پر پھیلے ہوئے بنگلے کے مین گیٹ پر پہنچی تو شام ہونے والی تھی - جب میں نے دیوار کے اوپر سے جھانک کر دیکھا تو کار گیراج میں موجود دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا کہ عدنان بھائی گھر ہی ہیں - میں نے کال بیل کا بٹن دبا دیا اور کھڑے کھڑے جاوید کا انتظار کرنے لگی - جاوید عدنان بھائی کے ہاں کئی برس سے ملازم تھا اور اس گھر میں کافی ہر دلعزیز بھی تھا - دروازہ کھلا تو سامنے بھابی کھڑی مسکرا رہی تھی -

"ارے تم آؤ آؤ رابیہ - اب تم تو ہمیں بھول ہی گئیں"

"نہیں بھابی - ایسی تو کوئی بات نہیں" - میں نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا - "بس مصروفیات نے گھیر رکھا تھا اور کچھ مسائل میں بھی اُلجھی رہی ورنہ ایک یہ تو گھر ہے جہاں آکر مجھے سچّی مسرّت ملتی ہے -"

سرسبز شاداب لان میں حسبِ معمول کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور خوبصورت پھول غائب تھے - وہاں بیٹھ کر مجھے خاموشی کا احساس ہوا - عجیب سناٹا چھایا ہوا تھا جس نے سارے ماحول کو اپنی گرفت میں لئے رکھا تھا -

عدنان بھائی ابھی تک وہاں نہیں آئے تھے نہ ہی بھابی میری آمد کی خبر کرنے گئی تھیں -

ادھورا موسم

موسم کئی دنوں سے خوشگوار تھا۔ فلک نے بادلوں کا چولا بدل کر دھوپ کا سنہری لباس زیب تن کر لیا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے موسم کچھ زیادہ ہی سہانا ہو گیا تھا۔ میں بے حد خوش تھی کہ قسمت نے بڑھ کر میرے بیٹے یاسر کے قدم چوم لئے اور وہ اب ڈاکٹر بن چکا تھا۔ میں جلدی جلدی یہ خوشخبری عدنان بھائی کو سنانا چاہتی تھی۔ میرے بہت سے عزیزوں میں وہ بھی اس کامیابی پر دل سے خوش ہونے والوں میں سے تھے۔ چونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کتنی محنت کر کے میں نے اسے یہاں تک پہنچایا تھا۔ پھر میں عرصہ دراز سے ان کے ہاں گئی بھی نہیں تھی۔ عدنان بھائی کے گھر جا کر ان سے باتیں کر کے میں ہمیشہ مسرور ہوتی تھی۔

چار برس کا عرصہ ایسے گذر گیا کہ طویل مدّت سے اپنے عزیزوں اور سہیلیوں سے بھی نہیں مل سکی۔ جب میں آخری بار عدنان بھائی کے گھر گئی تھی تو ان کا سرسبز لان رنگین کرسیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان کرسیوں پر عدنان بھائی ان کی شریک حیات، بیٹی زہرہ اور چھوٹا بیٹا شارق بیٹھا تھا۔ اس شام عدنان بھائی معمول کے مطابق موڈ میں تھے۔ خوب کھل کر باتیں کر رہے تھے، ہنس رہے تھے، ہنسا رہے تھے۔ پاس ہی ان کی نواسی نواسہ خوب شور مچا رہے تھے۔ زندگی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جانب منزل رواں دواں تھی۔ کچھ کمی تھی تو بس بڑے کاشف کی جو چند برس پہلے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلینڈ چلا گیا تھا اور جہاں ملازمت کے بعد اس نے اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کر لی تھی اور وہیں پر گرین کارڈ حاصل کر لیا تھا۔

عدنان بھائی نے اسے کچھ نہیں کہا وہ اپنی اولاد کے لئے باپ سے زیادہ

"کیا عدنان بھائی گھر میں نہیں ہیں؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"شام کو ٹہلنے چلے جاتے ہیں۔ آج ذرا جلدی ہی نکل گئے۔ بس آتے ہی ہونگے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے یہ معمول بنالیا ہے۔ آج کل گھر کا سودا سلف بھی خود ہی لاتے ہیں۔ اور نئے ملازم کی تلاش میں ہیں۔"

"کیوں، جاوید کو کیا ہوا؟"

"کئی ہفتے پہلے وہ چلا گیا"

"کہاں؟"

"اپنے شہر نہیں بلکہ اسی شہر میں کسی دوسری جگہ کام کر رہا ہے۔"

"شارق بھی نظر نہیں آرہا" کہیں گیا ہوا ہے۔

"کیا، تمہیں نہیں معلوم! تم تو مدّت کے بعد یہاں آئی ہو۔ کیا ہوا خیریت تو ہے"

"ہاں ہاں لیکن وہ بھی انگلینڈ سدھار گیا۔" کچھ دیر کے بعد اس کی بھی شادی وہیں کی ایک لڑکی سے ہو رہی ہے۔ اچھا میں نے مسکرانا چاہا لیکن بھابی کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر میری مسکراہٹ درمیان میں ہی دم توڑ گئی۔ میں ادھر دیکھنے لگی اور مجھے وہ سہانی شام یاد آگئی جب میں کافی عرصہ پہلے یہاں آئی تھی اور لان گھر والوں سے بھرا ہوا تھا۔ بچّے کھیل رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔ رنگین تتلی کو پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔"

"زہرہ ٹھیک ہے نا؟" میں نے چند منٹ بعد پوچھا۔

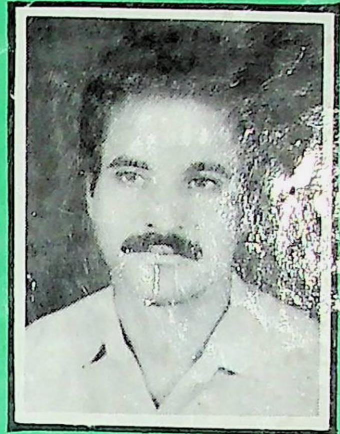
"ہاں کچھ دن قبل ہی رہ کر گئی ہے۔ اس کے شوہر کا تبادلہ بھی کراچی میں ہوگیا ہے۔ بھابی اس طرح چپ ہوگئی گویا کہانی اپنے اختتام کو پہنچ گئی ہو اور کچھ کہنے کو باقی نہ رہا ہو۔ میں نے پہلو بدلا اور رنگین تتلی کو دیکھنے لگی جو بے خوف سوکھی ہوئی بیلوں کے ارد گرد آزادی سے گھوم رہی تھی کیونکہ آج کوئی بچہ اس کی راہ میں حائل نہیں تھا۔ لیکن وہ خوبصورت پھول کی تلاش میں سرگرداں تھی جو پچھلے موسم میں مرجھا گئے تھے۔

پرویز مایوس نئی نسل کے جدید افسانہ نگار ہیں۔ اُن کی افسانوی عمر اگرچہ ابھی کم ہے لیکن تخلیقی ذہن کی صلاحیتیں ابتدائی کارناموں سے ہی نمایاں ہوتی ہیں۔ اُن کی تحریروں میں طنز کے شعلے لپکتے ہیں جو مجرم کو جھلسائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اُن کی تحریر کا تیکھاپن اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتا ہے۔ ان کے افسانوں کی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ وہ کردار کی ذات میں اتر کر اُس کے اندرون کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے ہیں۔ وہ کرداروں کے نفسیاتی تجزیے میں کافی غور وخوض سے کام لیتے ہیں۔ جیتی جاگتی زندگی سے لئے گئے ان کے کردار پورے سماج کی قدروں کے عکاس ہیں۔ ان کے چند افسانے "کچا گوشت" "ریلیف" "زخمی ہل" اور "چوتھا کونہ" وغیرہ جدید سماج کے کھوکھلے پن کے چہرے کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہے کہ تخلیق کے پردے کے پیچھے فن کار کی شخصیت جھلکتی ہے اور فن کا نقطہ نظر فنکار کے اندر کی آواز ہوتا ہے تو مایوس کے افسانے ان کی ذات کا آئینہ ہیں۔

"شکارے کی موت" ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس میں ان کا فن نئی منزلوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان کی ادبی خدمات قابل تحسین اور قابل ستائش ہیں۔

سُدرشن سنگھ
صدر سٹنڈرڈ ہارٹ کلب، جموں





پرویز مایوس افسانہ نگاری کے افق پر یوں طلوع ہوا ہے جس طرح کوہساروں کی اوٹ سے آفتاب، اُردو افسانہ نگاری کے اس عظیم الشان دور میں کسی نئے افسانہ نگار کا اس میدان میں اترنا اور پھر اپنی جگہ بنانا قابل تحسین اور قابل غور بات ہے۔ مایوس کو افسانے کی تکنیک اور زبان وبیان پر بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ اُن کا اسلوب ایک منفرد اسلوب ہے۔ جو موضوع کے اعتبار سے بلیغ اور مناسب بھی ہے۔ مایوس کے یہاں پلاٹ سازی، منظر نگاری، کردار نگاری، مکالمے، کہانی کی بُنت اور ترسیل کی فنکاری کا احساس ہوتا ہے۔ وہ الفاظ کا استعمال نہایت ہی احتیاط اور چابکدستی سے کرتے ہیں اور افسانے کو تمہید سے لیکر اختتام تک مختلف منزلوں سے کامیابی کے ساتھ گذارنے کا فن بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں دیہات کا ماحول اور کرداروں کے علاوہ وہاں کے جہنم زاروں کی تصویر، بھوک، لاچاری، جبر، افلاس اور سماجی نابرابری کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

"شکارے کی موت" ایک ایسا دریچہ ہے جس میں جھانک کر آپ اُن کے تخلیقی کرب کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اگر وہ اسی طرح سماج کے رِستے ہوئے ناسور اور پھیلی ہوئی آلودگی کو الفاظوں کی لڑی میں پرو کر اپنے افسانوں کا موضوع بناتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب وہ ہماری افسانوی حدود سے آگے نکل کر ان دیکھے میدان میں اپنے فن کا پرچم گاڑ کر پونچھ کا نام روشن کرے گا۔

جہانگیر میر

میر منزل، پونچھ